

تَفْهِيمُ الْوَلَبِ

سُورَةُ النُّورِ

۲۲

سید ابوالاعلم مودودی

فہرست

3	نام:	رکو ۲
3	زمانہ نزول:	رکو ۳
5	تاریخی پس منظر:	رکو ۵
17	موضوع اور مباحث:	رکو ۱۷
23		رکو ۲۳
102		رکو ۲۶
115		رکو ۳۶
123		رکو ۴۶
177		رکو ۵۶
188		رکو ۶۶
194		رکو ۷۶
202		رکو ۸۶
211		رکو ۹۶

نام:

پانچویں رکوع کی پہلی آیت **اَللّٰهُ نُورُ السَّمَاوٰتِ وَالْأَرْضِ** سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول:

یہ امر متفق علیہ ہے کہ یہ سورت غزوہ بنی الْمُصْطَلِقْ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ خود قرآن کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نزول واقعہ افک کے سلسلے میں ہوا ہے (جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دوسرے اور تیسرا رکوع میں آیا ہے) اور وہ تمام معتبر روایات کی رو سے غزوہ بنی الْمُصْطَلِقْ کے سفر میں پیش آیا تھا۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا یہ غزوہ 5 ہجری میں غزوہ احزاب سے پہلے ہوا تھا یا 6ھ میں غزوہ احزاب کے بعد۔ اصل واقعہ کیا ہے، اس کی تحقیق اس لیے ضروری ہے کہ پردے کے احکام قرآن مجید کی دو ہی سورتوں میں آئے ہیں، ایک یہ سورت، دوسری سورہ احزاب جس کا نزول بالاتفاق غزوہ احزاب کے موقع پر ہوا ہے۔ اب اگر غزوہ احزاب پہلے ہو تو اس کے معنی یہ ہی کہ پردے کے احکام کی ابتداء ان ہدایات سے ہوئی جو سورہ احزاب میں وارد ہوئی ہیں، اور تکمیل ان احکام سے ہوئی جو اس سورت میں آئے ہیں۔ اور اگر غزوہ بنی الْمُصْطَلِقْ پہلے ہو تو احکام کی ترتیب اللٹ جاتی ہے اور آغاز سورہ نور سے مان کر تکمیل سورہ احزاب والے احکام پر منی پڑتی ہے۔ اس طرح اس حکمت تشريع کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے جو احکام حجاب میں پائی جاتی ہے۔ اسی غرض کے لیے ہم آگے بڑھنے سے پہلے زمانہ نزول کی تحقیق کر لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ابن سعدؓ کا بیان ہے کہ غزوہ بنی الْمُصْطَلِقْ شعبان 5 ہجری میں پیش آیا اور پھر ذی القعدہ 5ھ میں غزوہ احزاب (یا غزوہ خندق) واقع ہوا۔ اس کی تائید میں سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ واقعہ افک کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ سے جو روایات مروی ہیں ان میں سے بعض میں حضرت سعدؓ بن عبادہ اور سعدؓ بن معاذ کے

جھگڑے کا ذکر آتا ہے، اور تمام معتبر روایات کی رو سے حضرت سعد بن معاذ کا انتقال غزوہ بن قریظہ میں ہوا تھا جس کا زمانہ واقع غزوہ احزاب کے متصلًا بعد ہے، لہذا 6ھ میں ان کے موجود ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

دوسری طرف محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوہ احزاب شوال 5ھ کا واقعہ ہے اور غزوہ بنی الْمُضطَلِقِ شعبان 6ھ کا۔ اس کی تائید وہ کثیر التعداد معتبر روایات کرتی ہیں جو اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ اور دوسرے لوگوں سے مروی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ افک سے پہلے احکام حجابت نازل ہو چکے تھے، اور وہ سورہ احزاب میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت زینبؓ سے نبی ﷺ کا نکاح ہو چکا تھا، اور وہ غزوہ احزاب کے بعد ذی القعدہ 5ھ کا واقعہ ہے اور سورہ احزاب میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ علاوہ بریں ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینبؓ کی بہن حمّة بنت جحش نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں مغض اس وجہ سے حصہ لیا تھا کہ حضرت عائشہؓ ان کی بہن کی سوکن تھیں، اور ظاہر ہے کہ بہن کی سوکن کے خلاف اس طرح کے جذبات پیدا ہونے کے لیے سوکناپے کا رشتہ شروع ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔ یہ سب شہادتیں ابن اسحاق کی روایت کو مضبوط کر دیتی ہیں۔

اس روایت کو قبول کرنے میں صرف یہ چیز مانع ہوتی ہے کہ واقعہ افک کے زمانے میں حضرت سعد بن معاذ کی موجودگی کا ذکر آیا ہے۔ مگر اس مشکل کو جو چیز رفع کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اس واقعہ کے متعلق حضرت عائشہؓ سے جو روایات مروی ہیں ان میں سے بعض میں حضرت سعد بن معاذ کا ذکر ہے اور بعض میں ان کے بجائے حضرت اُسَيْدُ بْنُ حُصَيْرَ کا۔ اور یہ دوسری روایت ان دوسرے واقعات کے ساتھ پوری طرح مطابق ہو جاتی ہے جو اس سلسلے میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں۔ ورنہ مغض سعد بن معاذ کے زمانہ حیات سے مطابق کرنے کی خاطر اگر غزوہ بنی الْمُضطَلِقِ اور قصہ افک کو غزوہ احزاب و قریظہ سے پہلے کے واقعات مان لیا جائے تو اس پیچیدگی کا کوئی حل نہیں ملتا کہ پھر آیت حجابت کا نزول اور نکاح زینبؓ کا واقعہ اس سے بھی

پہلے پیش آنا چاہیے، حالانکہ قرآن اور کثیر التعداد روایات صحیح، دونوں اس پر شاہد ہیں کہ نکاح زینبؓ اور حکم حجاب احزاب و قریظہ کے بعد کے واقعات ہیں۔ اسی بنا پر ابن حزم اور ابن قیم اور بعض دوسرے محققین نے محمد بن اسحاق کی روایت ہی کو صحیح قرار دیا ہے، اور ہم بھی اس کی صحیح سمجھتے ہیں۔

تاریخی پس منظر:

اب یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ سورہ نور ۶ ہجری کے نصف آخر میں سورہ احزاب کے کئی مہینے جا بعد نازل ہوئی ہے، ہمیں ان حالات پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے جن میں اس کا نزول ہوا۔

جنگ بدرا کی فتح سے عرب میں تحریک اسلامی کا جو عروج شروع ہوا تھا وہ غزوہ خندق تک پہنچتے پہنچتے اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ مشرکین، یہود، منافقین اور متربصین، سب ہی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس نو خیز طاقت کو محض ہتھیاروں اور فوجوں کے بل پر شکست نہیں دی جاسکتی۔ جنگ خندق میں ہ لوگ متعدد ہو کر 10 ہزار فوج کے ساتھ مدینے پر بڑھ آئے تھے، مگر ایک مہینے تک سرمارنے کے بعد آخر کار ناکام ہو کر چلے گئے اور ان کے جاتے ہیں نبی ﷺ نے علی الاعلان فرمادیا تھا **لَنْ تَغْزُوكُمْ قَرِيشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هُذَا**، ولکنکم **تَغْزُونَهُمْ** (ابن ہشام، جلد 3، 266)، ”اس سال بعد اب قریش تم پر بڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان پر بڑھائی کرو گے“۔

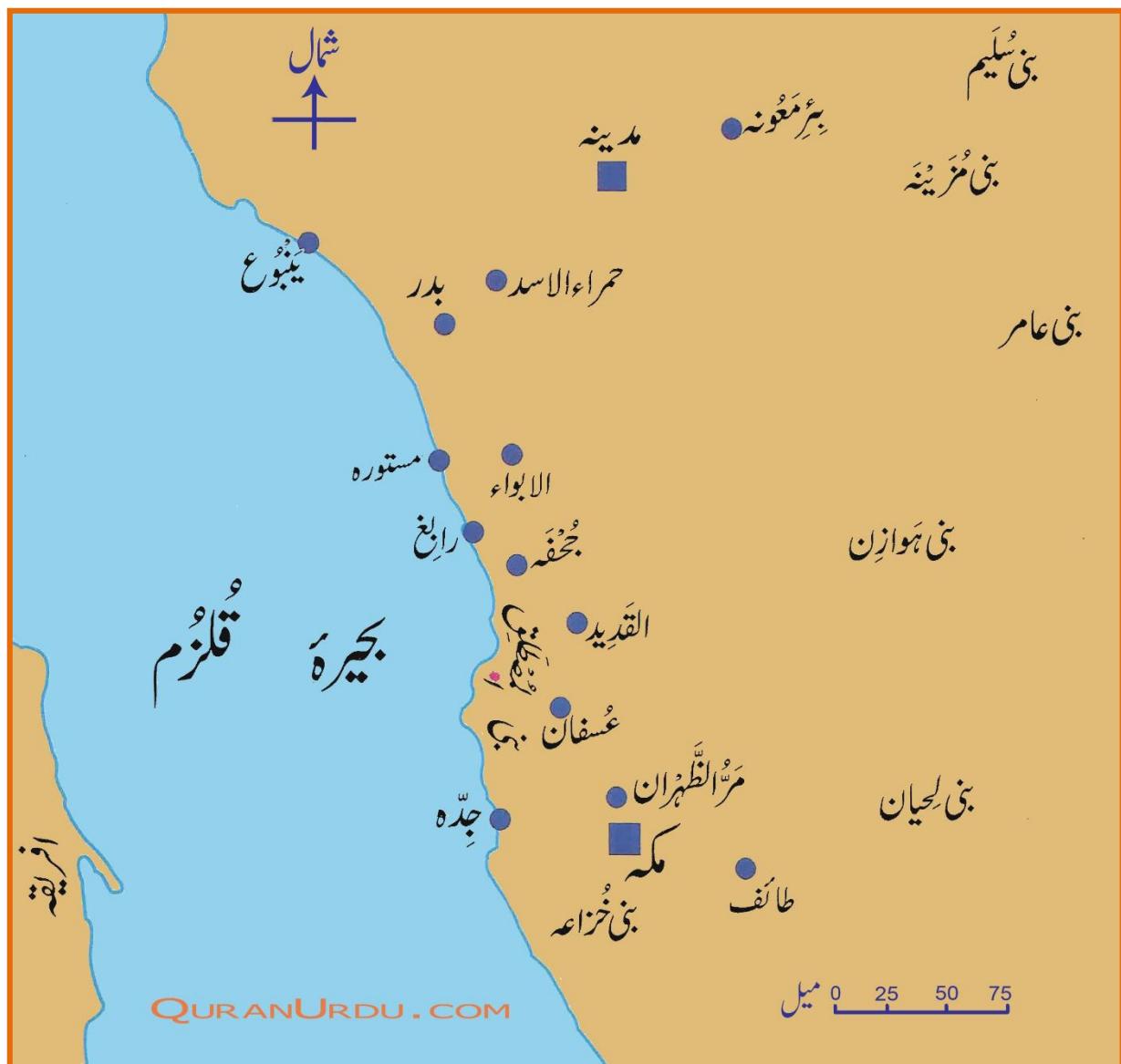
یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ مخالف اسلام طاقتوں کی قوت اقدام ختم ہو چکی ہے، اب اسلام بچاؤ کی نہیں بلکہ اقدام کی لڑائی لڑے گا اور کفر کو اقدام کے بجائے بچاؤ کی لڑائی لڑنی پڑے گی۔ یہ حالات کا بالکل صحیح جائزہ تھا جسے دوسرا فریق بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

اسلام کے اس روز افزون عروج کی اصل وجہ مسلمانوں کی تعداد نہ تھی۔ بدرا سے خندق تک ہر لڑائی میں کفار ان سے کئی گئی زیادہ قوت لے کر آئے تھے، اور مردم شماری کے لحاظے پر بھی مسلمان اس وقت تک

عرب میں بمشکل 10/1 فی صد ہی تھے۔ اس عروج کی وجہ مسلمانوں کے اسلحہ کی برتری بھی نہ تھی۔ ہر طرح کے ساز و سامان میں کفار، ہی کا پلہ بھاری تھا۔ معاشری طاقت اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا ان سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان کے پاس تمام عرب کے معاشری وسائل تھے، اور مسلمان بھوکوں میں مر رہے تھے۔ ان کی پشت پر تمام عرب کے مشرک اور اہل کتاب قبائل تھے، اور مسلمان ایک نئے دین کی دعوت دے کر قدیم نظام کے سارے حامیوں کی ہمدردیاں کھو چکے تھے۔ ان حالات میں جو چیز مسلمانوں کو برابر آگے بڑھائے لیے جا رہی تھی، وہ دراصل مسلمانوں کی اخلاقی برتری تھی جسے تمام دشمنان اسلام خود بھی محسوس کر رہے تھے۔ ایک طرف وہ دیکھتے تھے کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرامؐ کے بے داغ سیرتیں ہیں جن کی طہارت و پاکیزگی اور مضبوطی دلوں کو مسخر کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ انفرادی و اجتماعی اخلاق کی طہارت نے مسلمانوں کے اندر کمال درجے کا اتہاد اور نظم و ضبط بھی پیدا کر دیا ہے جس کے سامنے مشرکین اور یہود کا ڈھیلا نظام جماعتِ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں شکست کھاتا چلا جاتا ہے۔

کمینہ خصلت لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ جب وہ دوسرے کی خوبیاں اور اپنی کمزوریاں صریح طور پر دیکھ لیتے ہیں، اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اسے بڑھا رہی ہیں اور ان کی اپنی کمزوریاں انہیں گرا رہی ہیں، تو انہیں یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ اپنی کمزوریاں دور کریں اور اس کی خوبیاں اخذ کریں، بلکہ وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے اس کے اندر بھی اپنے ہی جیسی براہیاں پیدا کر دیں، اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اوپر خوب گندگی اچھالیں تاکہ دنیا کو اس کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔ یہی ذہنیت تھی جس نے اس مرحلے پر دشمنان اسلام کی سرگرمیوں کا رخ جنگی کارروائیوں سے ہٹا کر رذیلانہ حملوں اور داخلہ فتنہ انگلیزیوں کی طرف پھیردیا۔ اور چونکہ یہ خدمت باہر کے دشمنوں کی بہ نسبت خود مسلمانوں کے

نقشه غزوہ بنی المضطليق



اندر کے منافقین زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتے تھے، اس لیے بلارادہ یا بلا ارادہ طریق کاریہ قرار پایا کہ مدینہ کے منافقین اندر سے فتنے اٹھائیں اور یہود و مشرکین باہر سے ان کا زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

اس نئی تدبیر کا پہلا ظہور ذی القعدہ 5ھ میں ہوا جب کہ نبی ﷺ نے عرب سے تبنیت (دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانا اور خاندان میں اسے بالکل صلبی بیٹے کی حیثیت دے دینا۔) کی جاہلانہ رسم کا خاتمه کرنے کے لیے خود اپنے متبنیٰ (زید بن حارثہ) کی مظلّة بیوی (زینب بنت جحش) سے نکاح کیا۔ اس موقع پر مدینے کے منافقین پر و پیگنڈا کا ایک طوفان عظیم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر سے یہود و مشرکین نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر افtra پردازیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے عجیب عجیب قصے گھر گھر کر پھیلادیے کہ محمد (ﷺ) کس طرح اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے، اور کس طرح بیٹے کو ان کی عشق کا علم ہوا اور وہ طلاق دے کر بیوی سے دست بردار ہو گیا، اور پھر کس طرح انہوں نے خود اپنی بہو سے بیاہ کر لیا۔ یہ قصے اس کثرت سے پھیلائے گئے کہ مسلمان تک ان کے اثرات سے نہ نجح سکے۔ چنانچہ محدثین اور مفسرین کے ایک گروہ نے حضرت زینبؓ اور زید کے متعلق جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں آج تک ان من گھرست قصوں کے اجزا پائے جاتے ہیں اور مستشر قین مغرب ان کو خوب نمک مرج لگا کر اپنی کتابوں میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت زینبؓ نبی ﷺ کی حقیقی پھوپھی (أمیمہ بنت عبد المطلب) کی صاحزادی تھیں بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر حضور ﷺ کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی، ان کو اتفاقاً ایک روز دیکھ لینے اور معاذ اللہ ان پر عاشق ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس واقعہ سے ایک ہی سال پہلے نبی ﷺ نے خود ان کو مجبور کر کے حضرت زید سے ان کی شادی کی تھی۔ ان کے بھائی عبد اللہ بن جحش اس شادی سے ناراض تھے۔ خود حضرت زینبؓ اس پر راضی نہ تھیں، کیونکہ ایک آزاد کردہ

غلام کی بیوی بننا قریش کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی طبعاً قبول نہ کر سکتی تھی۔ مگر نبی ﷺ نے صرف اس لیے کہ مسلمانوں میں معاشرتی مساوات قائم کرنے کی ابتدا خود اپنے خاندان سے کریں، نہیں حکماً اس پر راضی کیا تھا۔ یہ ساری باتیں دوست اور دشمن سب کو معلوم تھیں، اور یہ بھی کسی سے چھپا ہوانہ تھا کہ حضرت زینبؓ کا احساس فخر نسبی ہی وہ اصل وجہ تھی جس کی بنا پر ان کا اور زید بن حارثہ کا نباهنہ ہو سکا اور آخر کار طلاق تک نوبت پہنچی۔ مگر اس کے باوجود بے شرم افترا پروازوں نے نبی ﷺ پر بدترین اخلاقی الزامات لگائے اور ان کو اس کثرت سے روانج دیا کہ آج تک انکا یہ پروپیگنڈا اپنارنگ دکھارہا ہے۔

اس کے بعد دوسرا حملہ غزوه بنی اُمُّصَلِّق کے موقع پر کیا گیا، اور یہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔

بنی اُمُّصَلِّق قبیلہ بنی خزاعہ کی ایک شاخ تھی جو ساحل بحر احمر پر جدے اور رابع کے درمیان قدید کے علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے چشمے کا نام مریسیع تھا جس کے آس پاس اس قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اس مناسبت سے احادیث میں اس مہم کا نام غزوہ رَرِیسیع بھی آیا ہے۔ نقشے سے اس کی صحیح جائے وقوع معلوم ہو سکتی ہے۔

شعبان 6ھ میں نبی ﷺ کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور دوسرے قبائل کو بھی جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپ ﷺ ایک لشکر لے کر ان کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ فتنے کے سڑاٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دیا جائے۔ اس مہم میں عبد اللہ بن ابی بھی منافقوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آپ کے ساتھ ہو گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کسی جنگ میں منافقین اس کثرت سے شامل نہ ہوئے تھے۔ مریسیع کے مقام پر آنحضرت ﷺ نے اچانک دشمن کو جالیا۔ اور تھوڑی سی رد خورد کے بعد پورے قبیلے کو مال اسباب سمیت گرفتار کر لیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر بھی مریسیع ہی پر لشکر اسلام پڑا اور ڈالے ہوئے تھا کہ ایک روز حضرت عمرؓ کے ایک ملازم

(جہنگاہ بن مسعود غفاری) اور قبیلہ خزرج کے ایک حلیف (سنان بن دبر جہنی) کے درمیان پانی پر جھگڑا ہوا گیا۔ ایک نے انصار کو پکارا۔ دوسرے نے مہاجرین کو آواز دی۔ لوگ دونوں طرف سے جمع ہو گئے اور معاملہ رفع کر دیا گیا۔ لیکن عبد اللہ بن ابی نے جو انصار قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتا تھا، بات کا بتگلر بنادیا۔ اس نے انصار کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا کہ ”یہ مہاجرین ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ہمارے حریف بن بیٹھے ہیں۔ ہماری اور ان قریشی کنگلوں کی مثال ایسی ہے کہ کتنے کوپال تاکہ تجھی کو بھنجھوڑ کھائے۔ یہ سب کچھ تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم لوگوں نے خود ہی انہیں لا کر اپنے ہاں بسا یا ہے اور ان کو اپنے مال و جاندار میں حصہ دار بنایا ہے۔ آج اگر تم ان سے ہاتھ کھیچ لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں“۔ پھر اس نے قسم کھا کر کہا کہ ”مدینے والیں پہنچنے کے بعد جو ہم میں سے عزت والا ہے وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کر دے (سورہ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے خود اس کا یہ قول نقل فرمایا ہے) گا۔“ اس کی ان باتوں کی اطلاع جب نبی ﷺ کو پہنچی تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو قتل کر ا دینا چاہیے۔ مگر حضور ﷺ نے فرمایا فکیف یا عبرا اذا تحدث الناس ان محمد ایقتل اصحابه (عمرؓ، دنیا کیا کہے گی محمد ﷺ خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے)۔ پھر آپ ﷺ نے فوراً ہی اس مقام سے کوچ کر حکم دے دیا اور دوسرے دن دو پھر تک کسی جگہ پڑاؤ نہ کیا، تاکہ لوگ خوب تھک جائیں اور کسی کو بیٹھ کرچہ میگوئیاں کرنے اور سننے کی مہلت نہ ملے۔ راستے میں اسید بن حضیر نے عرض کیا ”یا نبی ﷺ اللہ، آج آپ نے اپنے معمول کے خلاف ناوقت کوچ کا حکم دے دیا؟“ آپ ﷺ نے جواب دیا۔ ”تم نے سنا نہیں کہ تمہارے صاحب نے کیا باتیں کی ہیں“۔ انہوں نے پوچھا ”کون صاحب؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”عبد اللہ بن ابی“۔ انہوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ، اس شخص سے رعایت فرمائیے، آپ ﷺ جب مدینے تشریف لائے ہیں تو ہم لوگ اس اپنا بادشاہ“

بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے تاریخ تیار ہوا تھا۔ آپ ﷺ کی آمد سے اس کا بنا بنا یا کھیل بگڑ گیا۔ اسی کی جملہ وہ نکال رہا ہے۔“

یہ شو شہ ابھی تازہ ہی تھا کہ اسی سفر میں اس نے ایک اور خطرناک فتنہ اٹھا دیا، اور فتنہ بھی ایسا کہ اگر نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے جاں شار صحابہؓ کمال درجہ ضبط و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے و مدینے کی نو خیز مسلم سوسائٹی میں سخت خانہ جنگلی برپا ہو جاتی۔ یہ حضرت عائشہؓ پر تہمت کا فتنہ تھا۔ اس کا واقعہ خود انہیں کی زبان سے سینے جس سے پوری صورت حال سامنے آجائے گی۔ پیچ پیچ میں جو امور تشریح طلب ہوں گے انہیں ہم دوسری معتبر روایات کی مدد سے قوسمیں میں بڑھاتے جائیں گے تاکہ جناب صدیقہؓ کے تسلسل بیان میں خلل نہ واقعہ وہ۔ فرماتی ہیں :

”رسول اللہ ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ ﷺ کی بیویوں میں سے کون آپ ﷺ کے ساتھ جائے¹ غزوہ بنی المصطفیٰ کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپ ﷺ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینے کے قریب تھے، ایک منزل پر رات کے وقت

¹ اس قرعہ اندازی کی نوعیت لاٹری کی سی نہ تھی۔ دراصل تمام بیویوں کے حقوق برابر کے تھے۔ ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ اب اگر نبی ﷺ خود کسی کو انتخاب کرتے تو دوسری بیویوں کی دل شکنی ہوتی، اور ان میں باہم رشک و رقابت پیدا ہونے کے لیے بھی یہ ایک محرك بن جاتا۔ اس لیے آپ ﷺ قرعہ اندازی سے اس کا فیصلہ فرماتے تھے۔ شریعت میں قرعہ اندازی ایسی ہی سور توں کے لیے ہے جب کہ چند آدمیوں کا جائز حق بالکل برابر ہو، اور کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو، مگر حق کسی ایک ہی کو دیا جاسکتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے پڑا و کیا، اور بھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی، اور جب پلنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے لگے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی، اور اتنے میں قافلہ روانہ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہودے میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب سے بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ میرا ہودہ اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہودہ اونٹ پر رکھ کر روانہ ہو گئے۔ میں جن ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب یہ لوگ مجھ نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ اسی حالت میں مجھ کو نیند آگئی۔ صحیح کے وقت سفوان بن معطل سُلَمِی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سورہی تھی اور مجھے دیکھتے ہیں پہچان گئے، کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ (یہ صاحب بد ری صحابیوں میں سے تھے۔ ان کو صحیح دیر تک سونے کے عادت² تھی، اس لیے یہ بھی لشکر گاہ میں کہیں پڑے سوتے رہ گئے تھے اور اب اٹھ کر

² ابو داؤد اور دوسری کتب سنن میں یہ ذکر آتا ہے کہ ان کی بیوی نے نبی ﷺ سے ان کی شکایت کی تھی کہ یہ کبھی صحیح کی نمازوں وقت پر نہیں پڑھتے۔ انہوں نے عذر پیش کیا کہ یا رسول ﷺ میرا خاندانی عیب ہے، دیر تک سوتے رہنے کی اس کمزوری کو میں کسی طرح دور نہیں کر سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اچھا جب آنکھ کھلے نماز ادا کر لیا کرو۔ بعض محدثین نے ان کے قافلے سے پیچے رہ جانے کی وجہ بیان کی ہے۔ مگر بعض دوسرے محدثین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ان کو اس خدمت پر مقرر کیا تھا کہ رات کے اندر ہیرے میں کوچ کرنے کی وجہ سے اگر کسی کی کوئی چیز چھوٹ گئی ہو تو صحیح اسے تلاش کر کے لیتے آئیں۔

مدینے جا رہے تھے) مجھے دیکھ کر انہوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا **إِنَّا يَلْهُ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** رسول اللہ ﷺ کی بیوی یہیں رہ گئیں“۔ اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، لا کر اپنا اونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکلیں پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپھر کے قریب ہم نے لشکر کو جایا جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھیرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی یہ پتہ نہ چلا تھا کہ میں پچھے چھوٹ گئی ہوں۔ اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھادیے اور ان میں سب سے پیش پیش عبد اللہ بن ابی تھا۔ مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔

(دوسری روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صفویان کے اونٹ پر حضرت عائشہؓ لشکر گاہ میں پہنچیں اور معلوم ہوا کہ آپ اس طرح پچھے چھوٹ گئی تھیں اسی وقت عبد اللہ بن ابی پکارا ٹھاکہ ”خدا کی قسم یہ نج کرن نہیں آئی ہے، لو دیکھو، تمہارے نبی کی بیوی نے رات ایک اور شخص کے ساتھ گزاری اور اب وہ اسے علانیہ لیے چلا آرہا ہے)

”مدینے پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اُڑ رہی تھیں، رسول اللہ ﷺ کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی، مگر مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے ہٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول ﷺ کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ﷺ آپ گھر میں آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے: **كِيف تَيَكُمْ** (کیسی ہیں یہ؟)۔ خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چل گئی تاکہ وہ میری تیارداری اچھی طرح کر سکیں۔

ایک روزرات کے وقت جدت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلانہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسٹح بن اُثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ (دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، مگر اس احسان کے باوجود مسٹح بھی ان لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہؓ کے خلاف اس بہتان کو پھیلارہے تھے)۔ راستے میں ان کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا غارت ہو مسٹح۔ میں نے کہ اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو، اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا ”بیٹا، کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟ پھر انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ افتار پرواہ لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے ان میں مسٹح، حسان بن ثابت مشہور شاعر السلام، اور حنہہ بنت جحش، حضرت زینبؓ کی بہن کا حصہ سب سے نمایاں تھا)۔ یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا، وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی، سیدھی گھر گئی اور رات بھر رورو کر کاٹی۔“

آگے چل کر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، ”میرے پچھے رسول اللہ ﷺ نے علیؑ اور اسامہؓ بن زید کو بلا یا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اسامہ نے میرے حق میں کلمہ خیر کہا اور عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ، بھلائی کے سوا آپ ﷺ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں پائی۔ یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جو اڑایا جا رہا ہے۔“ رہے علیؑ تو انہوں نے کہا ”یا رسول اللہ ﷺ عورتوں کی کمی نہیں ہے، آپ ﷺ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں، اور حقیق کرنا چاہیں تو خدمت کارلو نڈی کو بلا کر حالات دریافت فرمائیں۔“ چنانچہ خدمت گار کو بلا یا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے کہا ”اس خدا کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جاسکے۔ بس اتنا عجیب ہے کہ میں آٹا گوندھ کر کسی کام

کو جاتی ہوں اور کہ ہجاتی ہوں کہ بیوی ذرا آٹے کا خیال رکھنا، مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے۔ اسی روز رسول اللہ ﷺ نے خطبہ میں فرمایا ”مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھروں والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے، اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تهمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی

³ میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔ اس پر اسید بن حضیر (بعض روایات میں سعد بن معاذ) نے اٹھ کر کہا ”یا رسول اللہ ﷺ، اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں، اور اگر ہمارے بھائی خزر جیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں، ہم تعییل کے لیے حاضر ہیں۔“ یہ سننہ ہی سعد بن عبادہ، رئیس خزر ج اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ”جوہوت کہتے ہو، تم ہر گز اسے نہیں مار سکتے۔ تم اس کی گردن کا نے کا نام صرف اس لیے ل رہے ہو کہ وہ خزر ج میں سے ہے۔ اگر وہ تمہارے قبیلے کا آدمی ہو تو تم کبھی یہ نہ کہتے کہ ہم اس کی گردن مار دیں“ ⁴۔ اسید بن حضیر نے جواب میں کہا ”تم منافق ہو اسی لیے منافقوں کی

³ غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے نام لینے کے بجائے سید اوس کے الفاظ استعمال فرمائے ہوں گے کسی راوی نے اس سے مراد حضرت سعد بن معاذ کو سمجھ لیا، کیونکہ اپنی زندگی میں وہی قبیلہ اوس کے سردار تھے اور تاریخ میں وہی اس حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ حالانکہ دراصل اس واقعہ کے وقت ان کے چچازاد بھائی اسید بن حضیر اوس کے سردار تھے۔

⁴ حضرت سعد بن عبادہ اگرچہ نہایت صالح اور مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گھری عقیدت و محبت رکھتے تھے، اور مدینے میں جن لوگوں کے ذریعہ سے اسلام پھیلا تھا ان میں ایک نمایاں شخص وہ بھی تھے، لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود ان کے اندر قومی جمی (اور عرب میں اس وقت

حمایت کرتے ہو۔“ اس پر مسجد نبوی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف رکھتے تھے۔ قریب تھا کہ اوس اور خزرج مسجد ہی میں لڑپڑتے، مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کو ٹھنڈا کیا اور پھر منبر سے اتر آئے۔“

حضرت عائشہؓ کے قصے کی باقی تفصیلات ہم اثنائے تفسیر میں اس جگہ نقل کریں گے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی برآت نازل ہوئی ہے۔ یہاں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی نے یہ شوشہ چھوڑ کر بیک وقت کی شکار کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف اس نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق کی عزت پر حملہ کیا۔ دوسری طرف اس نے اسلامی تحریک کے بلند ترین اخلاقی وقار کو گرانے کی کوشش کی۔ تیسرا طرف اس نے یہ ایک ایسی چنگاری چینکی تھی کہ اگر اسلام اپنے پیروؤں کی کایانہ پلٹ چکا ہوتا تو مہاجرین اور انصار، اور خود انصار کے بھی دونوں قبیلے آپس میں لڑ مرتے۔

قوم کے معنی قبیلے کے تھے) بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے عبد اللہ بن ابی کی پشت پناہی کی، کیونکہ وہ ان کے قبیلے کا آدمی تھا۔ اسی وجہ سے فتح مکہ کے موقع پر ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ ”الیوم یوم الملحة، الیوم تستحل الحرمۃ“ آج کشت و خون کا دن ہے۔ آج یہاں کی حرمت حلال کی جائے گی،“ اور اس پر عتاب فرمایا کہ حضور ﷺ نے ان سے لشکر کا چھنڈا اپس لے لیا۔ پھر آخر کار یہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے انہوں نے حضور ﷺ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں یہ دعویٰ کیا کہ خلافت انصار کا حق ہے، اور جب ان کی بات نہ چلی اور انصار و مہاجرین سب نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو تنہا وہی ایک تھے جنہوں نے بیعت سے انکار کر دیا اور مرتے دم تک قریشی خلیفہ کی خلافت تسلیم نہ کی۔ (ملاحظہ ہو الاصابہ لابن حجر، اور الاستیعاب لابن بعد البر، ذکر سعد بن عبادہ۔ صفحہ 10-11)۔

موضوع اور مباحث:

یہ تھے وہ حالات جن میں پہلے حملہ کے موقع پر سورہ احزاب کے آخری 6 رکوع نازل ہوئے اور دوسرے حملہ کے موقع پر یہ سورہ نور اتری۔ اس لپس منظر کو نگاہ میں رکھ کر ان دونوں سورتوں کا ترتیب وار مطالعہ کیا جائے تو وہ حکمت اچھی طرح سمجھ میں آجائی ہے جوان کے احکام میں مضمرا ہے۔

منافقین مسلمانوں کو اس میدان میں شکست دینا چاہتے تھے جوان کے تفوق کا اصل میدان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے، بجائے اس کے کہ وہاں کے اخلاقی حملوں پر ایک غضبناک تقریر فرماتا، یا مسلمانوں کو جوابی حملے کرنے پر اکساتا، تمام تر توجہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے پر صرف فرمائی کہ تمہارے اخلاقی محاذ میں جہاں جہاں رخنے موجود ہیں ان کو بھرو اور اس محاذ کو اور زیادہ مضبوط کرلو۔ ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ نکاح زینبؓ کے موقع پر منافقین اور کفار نے کیا طوفان اٹھایا تھا۔ اب ذرا سورہ احزاب نکال کر پڑھیے، وہاں آپ دیکھیں گے کہ ٹھیک اسی طوفان کا زمانہ تھا جب کہ معاشرتی اصلاح کے متعلق حسب ذیل ہدایات دی گئیں:

(۱) ازواج مطہرات کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو، بناؤ سنگھار کر کے باہر نہ نکلو، اور غیر مردوں سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہو تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ کوئی شخص بے جا توقعات قائم کرے (آیات 32-33)۔

(۲) حضور ﷺ کے گھروں میں غیر مردوں کے بلا اجازت داخل ہو جانے کو روک دیا گیا، اور ہدایت کی گئی کہ ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پر دے کے پچھے سے مانگو۔ (آیت 53)۔

(۳) غیر محروم مردوں اور محروم رشتہ داروں کے درمیان فرق قائم کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ازواج مطہرات کے صرف محروم رشتہ دار ہی آزادی کے ساتھ آپ ﷺ کے گھروں میں آ جاسکتے ہیں۔ (آیت 55)۔

(۴) مسلمانوں کو بتایا گیا کہ نبی کی بیویاں تمہاری مائیں ہیں اور ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان کے لیے ابد أحرا م ہیں جس طرح اس کی حقیقی ماں ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں ہر مسلمان اپنی نیت کو بالکل پاک رکھے۔ (آیت 53-54)۔

(۵) مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ نبی ﷺ کو اذیت دینا دنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت اور رسوا کن عذاب کا موجب ہے، اور اسی طرح کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا اور اس پر ناحق الزام لگانا بھی سخت گناہ ہے (آیت 57-58)۔

(۶) تمام مسلمان عورتوں کو حکم دے دیا گیا کہ جب باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو چادروں سے اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانک کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلا کریں (آیت 59)۔

پھر جب واقعہ افک سے مدینے کے معاشرے میں ایک ہلکل برپا ہوئی تو یہ سورہ نور اخلاق، معاشرت اور قانون کے ایسے احکام و ہدایات کے ساتھ نازل فرمائی گئی جن کا مقصد یہ تھا کہ اول تو مسلم معاشرے کو برائیوں کی پیداوار اور اور ان کے پھیلاؤ سے محفوظ رکھا جائے، اور اگر وہ پیدا ہو، ہی جائیں تو پھر ان کا پورا پورا تدارک کیا جائے۔ ان احکام و ہدایات کو ہم اسی ترتیب کے ساتھ یہاں خلاصہ درج کرتے ہیں جس کے ساتھ وہ اس سورے میں نازل ہوئے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے اندازہ کر سکیں کہ قرآن ٹھیک نفسیاتی موقع پر انسانی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لیے کس طرح قانونی، اخلاقی، اور معاشرتی تدبیر بیک وقت تجویز کرتا ہے :

(۱) زنا، جسے معاشرتی جرم پہلے ہی قرار دیا جا چکا تھا (سورہ نساء، آیات 15-16)، اب اس کو فوجداری جرم قرار دے کر اس کی سزا سو 100 کوڑے مقرر کر دی گئی۔

(۲) بد کار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا گیا اور ان کے ساتھ رشتہ مناکحت جوڑنے سے اہل ایمان کو منع کر دیا گیا۔

(۳) جو شخص دوسرے پر زنا کا الزام لگائے اور پھر ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کر سکے، اس کے لیے 80 کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

(۴) شوہر اگر بیوی پر تہمت لگائے تو اس کے لیے لعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔

(۵) حضرت عائشہ پر منافقین کے جھوٹے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کر کے ہر شریف آدمی کے خلاف ہر قسم کی تہمتیں قبول نہ کر لیا کرو، اور نہ ان کو پھیلاتے پھرو۔ اس طرح کی افواہیں اگر اڑ رہی ہوں تو انہیں دبانا اور ان کا سد باب کرنا چاہیے، نہ یہ ایک منہ سے لے کر دوسرا منہ اسے آگے پھونکنا شروع کر دے۔ اسی سلسلے میں یہ بات ایک اصولی حقیقت کے طور پر سمجھائی گئی کہ طیب آدمی کا جوڑ طیب عورت سے ہی لگ سکتا ہے، خبیث عورت کے اطوار سے اس کا مزاج چند روز بھی موافقت نہیں کر سکتا۔ اور ایسا ہی حال طیب عورت کا بھی ہوتا ہے کہ اس کی روح طیب مرد ہی سے موافقت کر سکتی ہے نہ کہ خبیث سے۔ اب اگر رسول ﷺ کو تم جانتے ہو کہ وہ ایک طیب، بلکہ اطیب انسان ہیں تو کس طرح یہ بات تمہاری عقل میں سما گئی کہ ایک خبیث عورت ان کی محبوب ترین رفیقہ حیات بن سکتی تھی۔ جو عورت عملًا زنا تک کر گزرے اس کے عام اطوار کب ایسے ہو سکتے ہیں کہ رسول ﷺ جیسا پاکیزہ انسان اس کے ساتھ یوں نباہ کرے۔ پس صرف یہ بات کہ ایک کمینہ آدمی نے ایک بیہودہ الزام کسی پر لگا دیا ہے، اسے قابل قبول کیا معنی قابل توجہ اور ممکن الواقع سمجھ لینے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ الزام لگانے والا ہے کون اور الزام لگا کس پر رہا ہے۔

(۶) جو لوگ بے ہودہ خبریں اور بری افواہیں پھیلائیں اور مسلم معاشرے میں فحش اور فواحش کو روایج دینے کی کوشش کریں، ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ہمت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔

- (۷) یہ قاعدہ کلیہ مقرر کیا گیا کہ مسلم معاشرے میں اجتماعی تعلقات کی بنیاد بآہمی حسن ظن پر ہونی چاہیے۔ ہر شخص بے گناہ سمجھا جائے جب تک کہ اس کے گنہگار ہونے کا ثبوت نہ ملے۔ نہ یہ کہ ہر شخص گناہ گار سمجھا جائے جب تک کہ اس کا بے گناہ ہونا ثابت نہ ہو جائے۔
- (۸) لوگوں کو عامہ ہدایت کی گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف نہ گھس جایا کریں بلکہ اجازت لے کر جائیں۔
- (۹) عورتوں اور مردوں کو غض بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گھورنے یا جھانک تاک کرنے سے منع کر دیا گیا۔
- (۱۰) عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں سر اور سینہ ڈھانک کر رکھیں۔
- (۱۱) عورتوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے محرم رشتہ داروں اور گھر کے خادموں کے سوا کسی کے سامنے بن سنوار کرنہ آئیں۔
- (۱۲) ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے بناؤ سنگھار کو چھپا کر نکلیں، بلکہ بجھنے والے زیور بھی پہن کرنہ نکلیں۔
- (۱۳) معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے بن بیا ہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کیے جائیں، حتیٰ کہ لوندیوں ور غلاموں کو بھی بن بیاہانہ رہنے دیا جائے۔ اس لیے کہ تجد نخش آفریں بھی ہوتا ہے اور نخش پذیر بھی۔ مجرد لوگ اور کچھ نہیں تو بری خبریں سننے اور پھیلانے ہی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔
- (۱۴) لوندیوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے مکتبت کی راہ نکال دی گئی اور مالکوں کے علاوہ دوسروں کو بھی حکم دیا گیا کہ مکاتب غلاموں اور لوندیوں کی مالی مدد کریں۔

(۱۵) لوندیوں سے کسب کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ عرب میں یہ پیشہ لوندیوں ہی سے کرنے کا رواج تھا، اس لیے اس کی ممانعت دراصل قبھہ گری کی قانونی بندش تھی۔

(۱۶) گھر یلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خلوت کے اوقات میں (یعنی صبح، دوپہر اور رات کے وقت) گھر کے کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گھس جایا کریں۔ اولاد تک کو اجازت لے کر آنے کی عادت ڈالی جائے۔

(۱۷) بوڑھی عورتوں کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اپنے گھر میں سر سے اوڑھیرا تار کر رکھ دیں تو مضائقہ نہیں، مگر حکم دیا گیا کہ ثہرُج (جن ٹھن کر اپنے آپ کو دکھانے) سے بچیں۔ نیز انہیں نصیحت کی گئی ہے بڑھاپے میں بھی اگر وہ اوڑھنیاں اپنے اوپر ڈالے ہی رہیں تو بہتر ہے۔

(۱۸) اندھے، لنگڑے، لوے، اور بیمار کو یہ رعایت دی گئی کہ وہ کھانے کی کوئی چیز کسی کے ہاں سے بلا اجازت کھالے تو اس کا شمار چوری اور خیانت میں نہ ہو گا۔ اس پر کوئی گرفت نہ کی جائے۔

(۱۹) قریبی عزیزوں اور بے تکلف دوستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاں بلا اجازت بھی کھا سکتے ہیں، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے گھر میں کھا سکتے ہیں۔ اس طرح معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا گیا اور ان کے درمیان سے بیگانگی کے پردے ہٹا دیے گئے تاکہ آپس کی محبت بڑھے اور باہمی اخلاص کے رابطے ان رخنوں کو بند کر دیں جن سے کوئی فتنہ پرواہ پھوٹ ڈال سکتا ہو۔

ان ہدایات کے ساتھ ساتھ منافقین اور مومنین کی وہ کھلی کھلی علامتیں بیان کر دی گئیں جن سے ہر مسلمان یہ جان سکے کہ معاشرے میں مخلص اہل ایمان کون لوگ ہیں اور منافق کون۔ دوسری طرف مسلمانوں کے جماعتی نظم و ضبط کو اور کس دیا گیا اور اس کے لیے چند مزید ضابطے بنادیے گئے تاکہ وہ طاقت اور زیادہ مضبوط ہو جائے جس سے غیظ کا اکر کفار و منافقین فساد انگیزیاں کر رہے تھے۔

اس تمام بحث میں نمایاں چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ پوری سورہ نور اس تلخی سے خالی ہے جو شر مناک اور بیہودہ حملوں کے جواب میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک طرف ان حالات کو دیکھیے جن میں یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ اور دوسری طرف سورت کے مضامین اور انداز کلام کو دیکھیے۔ اس قدر اشتعال انگیز صورت حال میں کیسے ٹھنڈے طریقے سے قانون سازی کی جا رہی ہے، مصلحانہ احکام دیے جا رہے ہیں، حکیمانہ ہدایات دی جا رہی ہیں، اور تعلیم و نصیحت کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اس سے صرف یہی سبق نہیں ملتا کہ ہم کو فتنوں کے مقابلے میں سخت سے سخت اشتعال کے موقع پر بھی کس طرح ٹھنڈے تدبیر اور عالی ظرفی اور حکمت سے کام لینا چاہیے، بلکہ اس سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہ کلام محمد ﷺ کا اپنا تصنیف کردہ نہیں ہے، کسی ایسی ہستی کا نازل کیا ہوا ہے جو بہت بلند مقام سے انسانی حالات اور معاملات کا مشاہدہ کر رہی ہے اور اپنی ذات میں ان حالات و معاملات سے غیر متأثر رہ کر خالص ہدایت و رہنمائی کا منصب اد کر رہی ہے۔ اگر یہ آنحضرت ﷺ کا اپنا کلام ہوتا تو آپ ﷺ کی انتہائی بلند نظری کے باوجود اس میں اس فطری تلخی کا کچھ نہ پکھنہ اثر تو ضرور پایا جاتا جو خود اپنی عزت و ناموس پر کمینہ حملوں کو سن کر ایک شریف آدمی کے جذبات میں لازماً پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

رَكْعٌ

سُورَةُ أَنْزَلْنَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنْزَلْنَا فِيهَا آيَتٍ بَيْنَتٍ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿١﴾ أَنَّ زَانِيَةً وَ
الزَّانِي فَاجْلِدُوهُ كُلَّاً وَاحِدِ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدٍ وَلَا تَأْخُذُ كُمْ بِهِمَا رَأْفَةً فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ
كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يَشْهُدُ عَذَابَهُمَا طَاءِفَةً مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢﴾
الَّذِي نَنْهَا لَا يَنْكِحُ لَا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِي لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانِي أَوْ مُشْرِكٌ وَحُرْمَة
ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣﴾ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةٍ شُهَدَاءَ
فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَنِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبِلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَسِقُونَ ﴿٤﴾ إِلَّا
الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥﴾ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ
وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءَ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ
الصَّدِيقِينَ ﴿٦﴾ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكُذَّابِينَ ﴿٧﴾ وَيَدْرُوْا عَنْهَا
الْعَذَابَ أَنْ تَشَهَّدَ أَرْبَعَ شَهَادَتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكُذَّابِينَ ﴿٨﴾ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ غَضَبَ
اللَّهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّدِيقِينَ ﴿٩﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَابٌ

حَكِيمٌ ﴿١٠﴾

رکوٰ١

اللہ کے نام سے جور حمل و رحیم ہے۔

یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، اور اسے ہم نے فرض کیا ہے، اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں، **۱** شاید کہ تم سبق لو۔

زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ **۲** اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامنگیرنا ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ **۳** اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہے۔ **۴**

زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرک کے ساتھ۔ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یہ مشرک۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہل ایمان پر۔ **۵**

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کرنہ آئیں، ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں کہ اللہ ضرور ﴿اُن کے حق میں﴾ غفور رحیم ہے۔ **۶**

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت ﴿یہ ہے کہ وہ﴾ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ ﴿اپنے الزام میں﴾ سچا ہے اور پانچویں بار کہہ کہ اُس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ ﴿اپنے الزام میں﴾ جھوٹا ہو۔ اور عورت

سے سزا اس طرح مل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص ﴿اپنے الزام میں﴾ جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اُس بندی پر اللہ کا غصب ٹوٹے اگر وہ ﴿اپنے الزام میں﴾ سچا ہو۔ **7** تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے، تو ﴿بیویوں پر الزام کا معاملہ تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا﴾۔ ۶۱

سورة النور حاشیہ نمبر: 1 ▲

ان سب فقروں میں "ہم نے" پر زور ہے۔ یعنی اس کا نازل کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ "ہم" ہیں، اس لیے اسے کسی بے زور ناصح کے کلام کی طرح ایک بلکلی چیز نہ سمجھ بیٹھنا۔ خوب جان لو کہ اس کا نازل کرنے والا وہ ہے جس کے قبضے میں تمہاری جانیں اور قسمتیں ہیں، اور جس کی گرفت سے تم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔ دوسرے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ جو باتیں اس سورے میں کہی گئی ہیں وہ "سفر شات" نہیں ہیں ہیں کہ آپ کا بھی چاہے تو مانیں ورنہ جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، بلکہ یہ قطعی احکام ہیں جن کی پیروی کرنا لازم ہے۔ اگر مومن اور مسلم ہو تو تمہارا فرض ہے کہ ان کے مطابق عمل کرو۔

تیسرا فقرے میں بتایا گیا ہے کہ جو ہدایات اس سورے میں دی جائی ہیں ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ صاف صاف اور کھلی کھلی ہدایات ہیں جن کے متعلق تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ فلاں بات ہماری سمجھ ہی میں نہیں آئی تھی تو ہم عمل کیسے کرتے۔

بس یہ اس فرمان مبارک کی تمہید (Preamble) ہے جس کے بعد احکام شروع ہو جاتے ہیں۔ اس تمہید کا انداز بیان خود بتا رہا ہے کہ سورہ نور کے احکام کو اللہ تعالیٰ کتنی اہمیت دے کر پیش فرم رہا ہے۔ کسی دوسری احکامی سورت کا دیباچہ اتنا پر زور نہیں ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 2 ▲

اس مسئلے کے بہت سے قانونی، اخلاقی اور تاریخی پہلو تشریع طلب ہیں جن کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو موجودہ زمانے میں ایک آدمی کے لیے اس تشریع اللہ کا سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے ذیل میں ہم اس کے مختلف پہلوؤں پر سلسلہ وار روشنی ڈالیں گے:

(۱) زنا کا عام مفہوم، جس سے ہر شخص واقف ہے، یہ ہے "ایک مرد اور ایک عورت، بغیر اس کے کہ ان کے درمیان جائز رشتہ زن و شوہو، باہم مباشرت کا ارتکاب کریں"۔ اس فعل کا اخلاقاً بر اہونا، یا مذہبیاً گناہ ہونا

یا معاشرتی حیثیت سے معیوب اور قابل اعتراض ہونا، ایک ایسی چیز ہے جس پر قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام انسانی معاشرے متفق رہے ہیں، اور اس میں بجز اُن متفرق لوگوں کے جنہوں نے اپنی عقل کو اپنی نفس پرستی کے تابع کر دیا ہے، یا جنہوں نے خبطی پن کی اُپیچ کو فلسفہ طرازی سمجھ رکھا ہے، کسی نے آج تک اختلاف نہیں کیا ہے۔ اس عالمگیر اتفاقِ رائے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت خود زنا کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ نوع انسانی کا بقاء اور انسانی تمدن کا قیام، دونوں اس بات پر منحصر ہیں کہ عورت اور مرد محض لطف اور لذت کے لیے ملنے اور پھر الگ ہو جانے میں آزاد نہ ہوں، بلکہ ہر جوڑے کا باہمی تعلق ایک ایسے مستقل اور پائیدار عہد و فا پر استوار ہو جو معاشرے میں معلوم و معروف بھی ہو اور جسے معاشرے کی ضمانت بھی حاصل ہو۔ اس کے بغیر انسانی نسل ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتی کیونکہ انسان کا بچہ اپنی زندگی اور اپنے انسانی نشوونما کے لیے کئی برس کی درد مندانہ نگہداشت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے، اور تنہا عورت اس بار کو اٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ مرد اس کا ساتھ نہ دے جو اس بچے کے وجود میں آنے کا سبب بنتا ہو۔ اسی طرح اس معاہدے کے بغیر انسانی تمدن بھی برقرار نہیں رہ سکتا، کیونکہ تمدن کی تو پیدائش ہی ایک مرد اور ایک عورت کے مل کر رہنے، ایک گھر اور ایک خاندان وجود میں لانے، اور پھر خاندانوں کے درمیان رشتے اور رابطے پیدا ہونے سے ہوئی ہے۔ اگر عورت اور مرد گھر اور خاندان کی تخلیق سے قطع نظر کر کے محض لطف ولذت کے لیے آزاد نہ ملنے لگیں تو سارے انسان بکھر کر رہ جائیں، اجتماعی زندگی کی جڑ کٹ جائے، اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے جس پر تہذیب و تمدن کی یہ عمارت اُٹھی ہے۔ ان وجوہ سے عورت اور مرد کا ایسا آزادانہ تعلق جو کسی معلوم و معروف اور مسلم عہد و فا پر مبنی نہ ہو، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انہی وجوہ سے انسان اس کو ہر زمانے میں ایک سخت عیب، ایک بڑی بد اخلاقی، اور مذہبی اصطلاح میں ایک شدید گناہ سمجھتا رہا ہے۔ اور انہی وجوہ سے ہر زمانے میں انسانی معاشروں نے نکاح

کی ترویج کے ساتھ ساتھ زنا کے سدیب کی بھی کسی نہ کسی طور پر ضرور کوشش کی ہے۔ البتہ اس کو شش کی شکلوں میں مختلف قوانین اور اخلاقی و تمدنی اور مذہبی نظاموں میں فرق رہا ہے، جس کی بنیاد دراصل اس فرق پر ہے کہ نوع اور تمدن کے لیے زنا کے نقصان دہ ہونے کا شعور کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ، کہیں واضح ہے اور کہیں دوسرے مسائل سے الجھ کر رہ گیا ہے۔

(۲) زنا کی حرمت پر متفق ہونے کے بعد اختلاف جس امر میں ہوا ہے وہ اس کے جرم، یعنی قانوناً مستلزم سزا ہونے کا مسئلہ ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور دوسرے مذاہب اور قوانین کا اختلاف شروع ہوتا ہے۔ انسانی فطرت سے قریب جو معاشرے رہے ہیں، انہوں نے ہمیشہ زنا، یعنی عورت اور مرد کے ناجائز تعلق کے بجائے خود ایک جرم سمجھا ہے اور اس کے لیے سخت سزا میں رکھی ہیں۔ لیکن جوں جوں انسانی معاشروں کو تمدن خراب کرتا گیا ہے، رویہ نرم ہوتا چلا گیا ہے۔

اس معاملے میں اویں تساؤں، جس کا ارتکاب بالعموم کیا گیا، یہ تھا کہ ”محض زنا“ (Fornication) اور ”زنابزن غیر“ (Adultery) میں فرق کر کے، اول الذکر کو ایک معمولی سی غلطی، اور صرف موخر الذکر کو جرم مستلزم سزا قرار دیا گیا۔

محض زنا کی تعریف جو مختلف قوانین میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ”کوئی مرد، خواہ وہ کنووار اہو یا شادی شدہ، کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو کسی دوسرے شخص کی بیوی نہ ہو“۔ اس تعریف میں اصل اعتبار مرد کی حالت کا نہیں، بلکہ عورت کی حالت کا کیا گیا ہے۔ عورت اگر بے شوہر ہے تو اس سے مباشرت محض زنا ہے، قطع نظر اس سے کہ مرد بیوی رکھتا ہو یا نہ ہو۔ قدیم مصر، باہل، آشور (اسیریا) اور ہندوستان کے قوانین میں اس کی سزا بہت ہلکی تھی۔ اسی قاعدے کو یونان اور روم نے اختیار کیا، اور اسی سے آخر کار

یہودی بھی متاثر ہو گئے۔ بائبل میں یہ صرف ایک ایسا قصور ہے جس سے مرد پر محض مالی تاوان واجب آتا ہے۔ کتاب ”خرونج“ میں اس کے متعلق جو حکم ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

”اگر کوئی آدمی کسی کنواری کو، جس کی نسبت (یعنی منگنی) نہ ہوئی ہو پھنسلا کر اس سے مباشرت کر لے تو وہ ضرور ہی اسے مہر دے کر اس سے بیاہ کر لے، لیکن اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اس لڑکی کو اسے دے، تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق (یعنی جتنا مہر کسی کنواری لڑکی کو دیا جاتا ہو) اسے نقدی دے۔“

(باب ۲۲۔ آیت ۱۶-۲۷)۔

کتاب ”استثناء“ میں یہی حکم ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوا ہے، اور پھر تصریح کی گئی ہے کہ مرد سے لڑکی کے باپ کے پچاس مثقال چاندی (تقرباً ۵۵ روپے) تاوان دلوایا جائے (باب ۲۲۔ آیت ۲۸-۲۹)۔ البتہ اگر کوئی شخص کا ہن (یعنی پروہت، Priest) کی بیٹی سے زنا کرے تو اس کے لیے یہودی قانون میں پھانسی کی سزا ہے، اور لڑکی کے لیے زندہ جلانے کی (Everyman's Talmud, P. 319-20)۔

یہ تخلیل ہندوں تخلیل سے کس قدر مشابہ ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے منودھرم شاستر سے مقابلہ کر کے دیکھیے وہاں لکھا ہے کہ:

”جو شخص اپنی ذات کی کنواری لڑکی سے اس کی رضا مندی کے ساتھ زنا کرے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں ہے۔ لڑکی کا باپ راضی ہو تو وہ اس کو معاوضہ دے کر شادی کر لے۔ البتہ اگر لڑکی اوپنچی ذات کی ہو اور مرد تین ذات کا تو لڑکی کو گھر سے نکال دینا چاہیے اور مرد کو قطع اعضا کی سزا دینی چاہیے“ (ادھیارے ۱۸ اشلوک ۳۶۵، ۳۶۶) اور یہ سزا زندہ جلا دیے جانے کی سزا میں تبدیل کی جا سکتی ہے جبکہ لڑکی برہمن ہو (اشلوک ۳۷۷)۔

در اصل ان سب قوانین میں زنا بزنِ غیر ہی اصلی اور بڑا جرم تھا یعنی یہ کہ کوئی شخص (خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو دوسرے شخص کی بیوی ہو۔ اس فعل کے جرم ہونے کی بنیاد یہ نہ تھی کہ ایک مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ یہ تھی کہ اُن دونوں نے مل کر ایک شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسے کسی ایسے بچے کو پالنا پڑے جو اس کا نہیں ہے۔ گویا زنا نہیں بلکہ اختلاطِ نسب کا خطرہ اور ایک کے بچے کا دوسرے کے خرچ پر پلننا اور اس کا وارث ہونا اصل بنائے جرم تھا جس کی وجہ سے عورت اور مرد دونوں مجرم قرار پاتے تھے۔ مصریوں کے ہاں اس کی سزا یہ تھی کہ مرد کو لاٹھیوں سے خوب پیٹا جائے اور عورت کی ناک کاٹ دی جائے۔ قریب قریب ایسی ہی سزا نہیں با بل، اشور، اور قدیم ایران میں بھی راجح تھیں۔ ہندوؤں کے ہاں عورت کی سزا یہ تھی کہ اس کو کتوں سے پھردا دیا جائے اور مرد کو یہ کہ اسے لو ہے کے گرم پینگ پر لٹا کر چاروں طرف آگ جلا دی جائے۔ یونان اور روم میں ابتداءً ایک مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو زنا کرتے دیکھ لے تو اسے قتل کر دے، یا چاہے تو اس سے مالی تاوان حاصل کر لے۔ پھر پہلی صدی قبل مسیح میں قیصر آگسٹس نے یہ قانون مقرر کیا کہ مرد کی آدمی جائداد ضبط کر کے اسے جلاوطن کر دیا جائے، اور عورت کا آدھام ہر ساقط اور اس کی ۱/۳ جائداد ضبط کر کے اُسے بھی مملکت کے کسی دور دراز حصے میں بھیج دیا جائے۔ قسطنطین نے اس قانون کو بدل کر عورت اور مرد دونوں کے لیے سزا نے موت مقرر کی۔ لیو (Leo) اور مارسین (Marcian) کے دور میں اس سزا کو جس دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر قیصر جسٹسینین نے اس میں مزید تخفیف کر کے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ عورت کو کوڑوں سے پیٹ کر کسی راہب خانے میں ڈال دیا جائے اور اس کے شوہر کو یہ حق دیا جائے کہ چاہے تو دو سال کے اندر اسے نکلوالے، ورنہ ساری عمر وہیں پڑا رہنے دے۔

یہودی قانون میں زنا بزنِ غیر کے متعلق جو احکام پائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:

”اگر کوئی کسی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لوندی اور کسی شخص کی مانگیتھر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ وہ آزاد کی گئی ہو، تو ان دونوں کو سزا ملے، لیکن وہ جان سے نہ مارے جائیں اس لیے کہ عورت آزاد نہ تھی۔“ (احباد ۱۹-۲۰)۔

”جو شخص دوسرے کی بیوی سے، یعنی اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں۔“ (احباد ۲۰-۱۰)۔

”اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ دونوں مارڈا لے جائیں۔“ (استثناء ۲۲-۲۲)۔

”اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو۔ (یعنی اس کی ملنگی ہو) اور کوئی دوسرा آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاطک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مرجائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسائے کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ پر اگر اس آدمی کو وہی لڑکی جس کی نسبت ہو چکی ہو، کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبڑا اس سے صحبت کرے تو فقط وہ آدمی ہی جس نے صحبت کی مارڈا لاجائے پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا۔“ (استثناء ۲۳-۲۶)۔

لیکن حضرت عیسیٰ کے عہد سے بہت پہلے یہودی علماء، فقہاء، امراء اور عوام، سب اس قانون کو عملًا منسُوخ کر چکے تھے۔ یہ اگرچہ باہم میں لکھا ہوا تھا کہ خدائی حکم اسی کو سمجھا جاتا تھا، مگر اسے عملًا نافذ کرنے کا کوئی روادار نہ تھا، حتیٰ کہ یہودیوں کی تاریخ میں اس کی کوئی نظری تک نہ پائی جاتی تھی کہ یہ حکم کبھی نافذ کیا گیا ہو۔ حضرت عیسیٰ جب دعوتِ حق لے کر اٹھے اور علماء یہود نے دیکھا کہ اس سیلا ب کو روکنے کی کوئی تدبیر کا رگر

نہیں ہو رہی ہے تو وہ ایک چال کے طور پر ایک زانیہ عورت کو آپ کے پاس پکڑ لائے اور کہا اس کا فیصلہ فرمائیے (یوحناب ۸، آیت ۱۱-۱۲)۔ اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کو کنوں یا کھائی، دونوں میں سے کسی ایک میں کو دنے پر مجبور کر دیں۔ اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور سزا تجویز کریں تو آپ کو یہ کہہ کر بدنام کیا جائے کہ لبھیے، یہ نرالے پیغمبر صاحب تشریف لائے ہیں جنہوں نے دنیوی مصلحتوں کی خاطر خدا تعالیٰ قانون کو بدل ڈالا۔ اور اگر آپ رجم کا حکم دیں تو ایک طرف رومی قانون سے آپ کو ٹکرایا جائے اور دوسری طرف قوم سے کہا جائے کہ مانوان پیغمبر صاحب کو، دیکھ لینا، اب توراة کی پوری شریعت تمہاری پیٹھوں اور جانوں پر بر سے گی۔ لیکن حضرت عیسیٰ نے ایک ہی فقرے میں ان کی چال کو انہی پر اُلٹ دیا۔ آپ نے فرمایا تم میں سے جو خود پاک دامن ہو وہ آگے بڑھ کر اسے پھر مارے۔ یہ سُنتہ ہی فقیہوں کی ساری بھیڑ چھٹ گئی، ایک ایک منہ چھپا کر رخصت ہو گیا اور ”حاملانِ شرع متین“ کی اخلاقی حالت بالکل برہنہ ہو کر رہ گئی۔ پھر جب عورت تنہا کھڑی ہو گئی تو آپ نے اسے نصیحت فرمائی اور توبہ کر اکے رخصت کر دیا، کیونکہ نہ آپ قاضی تھے کہ اس مقدمے کا فیصلہ کرتے، نہ اُس پر کوئی شہادت قائم ہوئی تھی، اور نہ کوئی اسلامی حکومت قانونِ الہی نافذ کرنے کے لیے موجود تھی۔

حضرت عیسیٰ کے اس واقعہ سے اور آپ کے چند اور متفرق اقوال سے جو مختلف موقع پر آپ نے ارشاد فرمائے، عیسائیوں نے غلط استنباط کر کے زنا کے جرم کا ایک اور تصور قائم کر لیا۔ ان کے ہاں زنا اگر غیر شادی شدہ مرد، غیر شادی شدہ عورت سے کرتے تو یہ گناہ تو ہے، مگر جرم مستلزم سزا نہیں ہے۔ اور اگر اس فعل کا کوئی ایک فریق، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، شادی شدہ ہو، یادوںوں شادی شدہ ہوں، تو یہ جرم ہے، مگر اس کو جرم بنانے والی چیز دراصل ”عہد شکنی“ ہے نہ کہ محض زنا۔ ان کے نزدیک جس نے بھی شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب کیا وہ اس لیے مجرم ہے کہ اُس نے اُس عہدِ وفا کو توڑ دیا جو قربان گاہ کے سامنے اس نے

پادری کے توسط سے اپنی بیوی یا اپنے شوہر کے ساتھ باندھا تھا۔ مگر اس جرم کی کوئی سزا اس کے سوانحیں ہے کہ زانی مرد کی بیوی اپنے شوہر کے خلاف بے وفائی کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے اور زانیہ عورت کا شوہر ایک طرف اپنی بیوی پر دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے اور دوسری طرف اُس شخص سے بھی تاو ان لینے کا حق دار ہو جس نے اس کی بیوی کو خراب کیا۔ بس یہ سزا ہے جو مسیحی قانون شادی شدہ زانیوں اور زانیات کو دیتا ہے، اور غضب یہ ہے کہ یہ سزا بھی دو دھاری تلوار ہے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر کے خلاف ”بے وفائی“ کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے تو وہ بے وفا شوہر سے تو نجات حاصل کر لے گی، لیکن مسیحی قانون کی رو سے پھر وہ عمر بھر کوئی دوسرا نکاح نہ کر سکے گی۔ اور ایسا ہی حشر اُس مرد کا بھی ہو گا جو بیوی پر ”بے وفائی“ کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے، کیونکہ مسیحی قانون اس کو بھی نکاح ثانی کا حق نہیں دیتا۔ گویا زوجین میں سے جس کو بھی تمام عمر را ہب بن کر رہنا ہو وہ اپنے شریک زندگی کی بے وفائی کا شکوہ مسیحی عدالت میں لے جائے۔

موجودہ زمانے کے مغربی قوانین، جن کی پیروی اب خود مسلمانوں کے بھی بیشتر ممالک کر رہے ہیں، انہی مختلف تصوّرات پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک زنا، عیب یا بد اخلاقی یا گناہ جو کچھ بھی ہو، جرم بہر حال نہیں ہے۔ اسے اگر کوئی چیز جرم بنا سکتی ہے تو وہ جبرا ہے، جبکہ فریق ثانی کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے مباشرت کی جائے۔ رہا کسی شادی شدہ مرد کا رتکاب زنا، تو وہ اگر وجہ شکایت ہے تو اس کی بیوی کے لیے ہے، وہ چاہے تو اس کا ثبوت دے کر طلاق حاصل کر لے۔ اور زنا کی مر تکب اگر شادی شدہ عورت ہے تو اس کے شوہر کو نہ صرف اس کے خلاف بلکہ زانی مرد کے خلاف بھی وجہ شکایت پیدا ہوتی ہے، اور دونوں پر دعویٰ کر کے وہ بیوی سے طلاق اور زانی مرد سے تاو ان وصول کر سکتا ہے۔

(۳) اسلامی قانون ان سب تصورات کے بر عکس زنا کو بجائے خود ایک جرم مستلزم سزا قرار دیتا ہے اور شادی شدہ ہو کر زنا کرنا اس کے نزدیک جرم کی شدت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے، نہ اس بنابر کہ مجرم نے کسی سے ”عہد شکنی“ کی، یا کسی دوسرے کے بستر پر دست درازی کی، بلکہ اس بنابر کہ اس کے لیے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ایک جائز ذریعہ موجود تھا اور پھر بھی اس نے ناجائز ذریعہ اختیار کیا۔ اسلامی قانون زنا کو اس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کی اگر آزادی ہو جائے تو ایک طرف نوع انسانی کی اور دوسری طرف تمدن انسانی کی جڑ کٹ جائے۔ نوع کی بقاء اور تمدن کے قیام، دونوں کے لیے ناگزیر ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق صرف قانون کے مطابق قابلِ اعتماد رابطے تک محدود ہو۔ اور اسے محدود رکھنا ممکن نہیں ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ آزادانہ تعلق کی بھی کھلی گنجائش موجود ہے۔ کیونکہ گھر اور خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالے بغیر جہاں لوگوں کو خواہشاتِ نفس کی تسکین کے موقع حاصل رہیں، وہاں ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ انہی خواہشات کی تسکین کے لیے وہ پھر اتنی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بیٹھنے کے لیے ٹکٹ کی شرط بے معنی ہے اگر بلا ٹکٹ سفر کرنے کی آزادی بھی لوگوں کو حاصل رہے۔ ٹکٹ کی شرط اگر ضروری ہے تو اسے موثر بنانے کے لیے بلا ٹکٹ سفر کو جرم ہونا چاہیے۔ پھر اگر کوئی شخص پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے بے ٹکٹ سفر کرے تو کم درجہ کا جرم ہے، اور مالدار ہوتے ہوئے بھی یہ حرکت کرے تو جرم اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔

(۴) اسلام انسانی معاشرے کو زنا کے خطرے سے بچانے کے لیے صرف قانونی تعزیر کے ہتھیار پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے وسیع پیمانے پر اصلاحی اور انسدادی تدابیر استعمال کرتا ہے، اور یہ قانونی تعزیر اس نے محض ایک آخری چارہ کار کے طور پر تجویز کی ہے۔ اس کا منشاء یہ نہیں ہے کہ لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے رہیں اور شب و روزان پر کوڑے برسانے کے لیے ٹکٹکیاں لگی رہیں، بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ

لوگ اس کا ارتکاب نہ کریں اور کسی کو اس پر سزادینے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ وہ سب سے پہلے آدمی کے نفس کی اصلاح کرتا ہے، اس کے دل میں عالم الغیب اور ہمہ گیر طاقت کے مالک خدا کا خوف بھاتا ہے، اُسے آخرت کی بازپرس کا احساس دلاتا ہے جس سے مر کر بھی پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، اُس میں قانونِ الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے، اور پھر اسے بار بار متنبہ کرتا ہے کہ زنا اور بے عصمتی اُن بڑے گناہوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ سخت بازپرس کرے گا۔ یہ مضمون سارے قرآن میں جگہ جگہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد وہ آدمی کے لیے نکاح کی تمام ممکن آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ ایک بیوی سے تسلیم نہ ہو تو چار چار تک سے جائز تعلق کا موقع دیتا ہے۔ دل نہ ملیں تو مرد کے لیے طلاق اور عورت کے لیے خلع کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ اور نام موافقت کی صورت میں خاندانی پنچایت سے لے کر سرکاری عدالت تک سے رجوع کا راستہ کھول دیتا ہے تاکہ یا تو مصالحت ہو جائے، یا پھر زوجین ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جہاں دل ملے نکاح کر لیں۔ یہ سب کچھ سورہ بقرہ، سورہ نساء، اور سورہ طلاق میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اسی سورہ نور میں آپ ابھی دیکھیں گے کہ مردوں اور عورتوں کے بن بیا ہے بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور صاف حکم دے دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے نکاح کر دیے جائیں، حتیٰ کہ لوڈیوں اور غلاموں کو بھی مجرد نہ چھوڑا جائے۔ پھر وہ معاشرے سے اُن اسباب کا خاتمه کرتا ہے جو زنا کی رغبت دلانے والے، اس کی تحریک کرنے والے، اور اس کے لیے موقع پیدا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ زنا کی سزا بیان کرنے سے ایک سال پہلے سورہ احزاب میں عورتوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ گھر سے نکلیں تو چادریں اوڑھ کر اور گھوٹکھٹ ڈال کر نکلیں، اور مسلمان عورتوں کے لیے جس نبی کا گھر نمونے کا گھر تھا اس کی عورتوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ گھروں میں وقار و سکنیت کے ساتھ بیٹھو، اپنے حسن اور بناؤ سنگھار کی نمائش نہ کرو، اور باہر کے مردم سے کوئی چیز لیں تو پردے کے پیچھے سے لیں۔ یہ نمونہ دیکھتے دیکھتے اُن تمام

صاحب ایمان عورتوں میں پھیل گیا جن کے نزدیک زمانہ جاہلیت کی بے حیا عورتیں نہیں بلکہ نبی ﷺ کی بیویاں اور بیٹیاں تقلید کے لائق تھیں۔ اس طرح فوجداری قانون کی سزا مقرر کرنے سے پہلے عورتوں اور مردوں کی خلط ملط معاشرت بند کی گئی، بنی سنوری عورتوں کا باہر نکلنا بند کیا گیا، اور ان اسباب و ذرائع کا دروازہ بند کر دیا گیا جوزنا کے موقع اور اس کی آسانیاں بھم پہنچاتے ہیں۔ ان سب کے بعد جب زنا کی فوجداری سزا مقرر کی گئی تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ اسی سورۂ نور میں اشاعتِ فحش کو بھی روکا جا رہا ہے، تجہبہ گری (Prostitution) کی قانونی بندش بھی کی جا رہی ہے، عورتوں اور مردوں پر بدکاری کے بے ثبوت الزام لگانے اور ان کے چرچے کرنے کے لیے بھی سخت سزا تجویز کی جا رہی ہے، غض بصر کا حکم دے کر نگاہوں پر پھرے بھی بٹھائے جا رہے ہیں تاکہ دیدہ بازی سے حسن پرستی تک اور حسن پرستی سے عشق بازی تک نوبت نہ پہنچے، اور عورتوں کو یہ حکم بھی دیا جا رہا ہے کہ اپنے گھروں میں محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کے درمیان تمیز کریں اور غیر محروم کے سامنے بن سنور کرنہ آئیں۔ اس سے آپ اُس پوری اصلاحی سکیم کو سمجھ سکتے ہیں جس کے ایک جزو کے طور پر زنا کی قانونی سزا مقرر کی گئی ہے۔ یہ سزا اس لیے ہے کہ تمام داخلی و خارجی تدابیر اصلاح کے باوجود جو شریرِ النفس لوگ کھلے ہوئے جائز موقع کو چھوڑ کرنا جائز طریقے سے ہی اپنی خواہش نفس پوری کرنے پر اصرار کریں ان کی کھال اُدھیر دی جائے، اور ایک بدکار کو سزادے کر معاشرے کے اُن بہت سے لوگوں کا نفیسیاتی آپریشن کر دیا جائے جو اس طرح کے میلانات رکھتے ہوں۔ یہ سزا محض ایک مجرم کی عقوبت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کا بالفعل اعلان بھی ہے کہ مسلم معاشرہ بدکاروں کی تفریح گاہ نہیں ہے جس میں ذوقین اور ذوقات اخلاقی قیود سے آزاد ہو کر مزرے لوٹتے پھریں۔ اس نقطہ نظر سے کوئی شخص اسلام کی اس اصلاحی اسکیم کو سمجھے تو وہ بآسانی محسوس کر لے گا کہ اس پوری اسکیم کا ایک جزو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ اس

میں رد و بدل کا خیال یا تو وہ نادان کر سکتا ہے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھے بغیر مصلح بن بیٹھا ہو، یا پھر وہ مفسد ایسا کر سکتا ہے جس کی اصل نیت اُس مقصد کو بدل دینے کی ہو جس کے لیے یہ اسکیم حکیم مطلق نے تجویز کی ہے۔

(۵) زنا کو قبلِ سزا فعل تو سمیہ میں ہی قرار دے دیا گیا تھا، لیکن اُس وقت یہ ایک "قانونی" جرم نہ تھا جس پر ریاست کی پولیس اور عدالت کوئی کارروائی کرے، بلکہ اس کی حیثیت ایک "معاشرتی" یا "خاندانی" جرم کی سی تھی جس پر اہل خاندان ہی کو بطورِ خود سزا دے لینے کا اختیار تھا۔ حکم یہ تھا کہ اگر چار گواہ اس امر کی شہادت دے دیں کہ انہوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے تو دونوں کو مارا پیٹا جائے، اور عورت کو گھر میں قید کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ قاعدہ "تا حکم ثانی" ہے، اصل قانون بعد میں آنے والا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۳۳۳)۔ اس کے ڈھائی تین سال بعد یہ حکم نازل ہوا جو آپ اس آیت میں پار ہے ہیں، اور اس نے حکم سابق کو منسوخ کر کے زنا کو ایک قانونی جرم قبلِ دست اندازی سرکار (Cognizable Offence) قرار دے دیا۔

(۶) اس آیت میں زنا کی جو سامقرر کی گئی ہے وہ دراصل "محض زنا" کی سزا ہے، زنا بعدِ احسان (یعنی شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کے ارتکاب) کی سزا ہے جو اسلامی قانون کی نگاہ میں سخت تر جرم ہے۔ یہ بات خود قرآن ہی کے ایک اشارے سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ یہاں اُس زنا کی سزا بیان کر رہا ہے جس کے فریقین غیر شادی شدہ ہوں۔ سورہ نساء میں پہلے ارشاد ہوا کہ:

وَالْتِي يَا تِينَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَاءٍ كُمْ فَاسْتَشِهْدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوا
فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سِيلًا

تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مر تکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔

اس کے بعد تھوڑی دور آگے چل کر پھر فرمایا:

وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طُولًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَا مَلَكَتْ
أَيْتَانُكُمْ مِنْ فَتَيَّتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ
فَإِنَّكُمْ حُوْهَنَ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَ وَ اتُوهُنَ أُجْوَرَهُنَ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتِ غَيْرَ مُسْفَحَاتِ وَ لَا
مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانِ فَإِذَا أُحْسِنَ فَإِنَّ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ
الْعَذَابِ

اور تم میں سے جو لوگ اتنی مقدرت نہ رکھتے ہوں کہ مومنوں میں سے مُحصنت کے ساتھ نکاح کریں تو وہ تمہاری مومن لوندیوں سے نکاح کر لیں۔۔۔۔۔ پھر اگر وہ (لوندیاں) مُحصنة ہو جانے کے بعد کسی بد چلنی کی مر تکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو مُحصنت کو (ایسے جرم پر) دی جائے۔

ان میں سے پہلی آیت میں توقع دلائی گئی ہے کہ زانیہ عورتیں جن کو سردست قید کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، اُن کے لیے اللہ تعالیٰ بعد میں کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ نور کا یہ دوسرا حکم وہی چیز ہے جس کا وعدہ سورہ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا تھا۔ دوسری آیت میں شادی شدہ لوندی کے ارتکابِ زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ یہاں ایک ہی آیت اور ایک ہی سلسلہ بیان میں دو جگہ مُحصنات کا لفظ استعمال ہوا ہے اور لا محالہ یہ ماننا پڑے گا کہ دونوں جگہ اس کے ایک ہی معنی ہیں۔۔۔ اب آغاز کے فقرے کو

دیکھیے تو وہاں کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ ”محسنات سے نکاح کرنے کی مقدرت نہ رکھتے ہوں“۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شادی شدہ عورت نہیں ہو سکتی بلکہ ایک آزاد خاندان کی بن بیا، ہی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اختتام کے فقرے میں فرمایا جاتا ہے کہ لوندی منکوحہ ہونے کے بعد اگر زنا کرے تو اس کو اس سزا سے آدھی سزادی جائے جو محسنات کو اس جرم پر ملنی چاہیے۔ سیاق و عبارت صاف بتاتا ہے کہ اس فقرے میں بھی محسنات کے معنی وہی ہیں جو پہلے فقرے میں تھے، یعنی شادی شدہ عورت نہیں بلکہ آزاد خاندان کی حفاظت میں رہنے والی بن بیا، ہی عورت۔ اس طرح سورہ نساء کی یہ دونوں آیتیں مل کر اس امر کی طرف اشارہ کر دیتی ہیں کہ سورہ نور کا یہ حکم، جس کا وہاں وعدہ کیا گیا تھا، غیر شادی شدہ لوگوں کے ارتکابِ زنا کی سزا بیان کرتا ہے (مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، النساء، حاشیہ ۳۶)۔

(۷) یہ امر کہ زنا بعد احسان کی سزا کیا ہے، قرآن مجید نہیں بتاتا بلکہ اس کا علم ہمیں حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ بکثرت معتبر روایات سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے صرف قولًا اس کی سزا رجم (سنگساری) بیان فرمائی ہے، بلکہ عملًا آپ نے متعدد مقدمات میں یہی سزا نافذ بھی کی ہے۔ پھر آپ کے بعد چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دور میں یہی سزا نافذ کی اور اسی کے قانونی سزا ہونے کا بار بار اعلان کیا۔ صحابہ کرام اور تابعین میں یہ مسئلہ بالکل متفق علیہ تھا۔ کسی ایک شخص کا بھی کوئی قول ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ قرین اول میں کسی کو اس کے ایک ثابت شدہ حکم شرعی ہونے میں کوئی شک تھا۔ ان کے بعد تمام زمانوں اور ملکوں کے فقهاء اسلام اس بات پر متفق رہے ہیں کہ یہ ایک سنتِ ثابتہ ہے، کیونکہ اس کی صحت کے اتنے متواتر اور قوی ثبوت موجود ہیں جن کے ہوتے کوئی صاحبِ علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ امت کی پوری تاریخ میں بجز خوارج اور بعض معتزلہ کے کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے، اور ان کے انکار کی بنیاد بھی یہ نہیں تھی کہ نبی ﷺ سے اس حکم کے ثبوت میں وہ کسی کمزوری کی

نشان دہی کر سکے ہوں، بلکہ وہ اسے ”قرآن کے خلاف“ قرار دیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے اپنے فہم قرآن کا قصور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن **الْزَانِيَةُ وَالْزَانِيٌّ** کے مطلق الفاظ استعمال کر کے اس کی سزا سوکوڑے بیان کرتا ہے، لہذا قرآن کی رو سے ہر قسم کے زانی اور زانیہ کی سزا یہی ہے اور اس سے زانی مُحْسِن کو الگ کر کے اس کی کوئی اور سزا تجویز کرنا قانونِ خداوند کی خلاف ورزی ہے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن کے الفاظ جو قانونی وزن رکھتے ہیں وہی قانونی وزن ان کی اُس شرط کا بھی ہے جو نبی ﷺ نے کی ہو، بشرطیکہ وہ آپ ﷺ سے ثابت ہو۔ قرآن نے ایسے ہی مطلق الفاظ میں **وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ** کا حکم بھی قطع یہ بیان کیا ہے۔ اس حکم کو اگر ان تشریحات سے مقید نہ کیا جائے جو نبی ﷺ سے ثابت ہیں تو اس کے الفاظ کی عمومیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ایک سوئی یا ایک بیر کی چوری پر بھی آدمی کو سارق قرار دیں اور پھر پکڑ کر اس کا ہاتھ شانے کے پاس سے کاٹ دیں۔ دوسری طرف لاکھوں روپے کی چوری والا بھی اگر گرفتار ہوتے ہی کہہ دے کہ میں انے اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہے اور اب میں چوری سے توبہ کرتا ہوں تو آپ کو اسے چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ قرآن کہتا ہے **فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوَبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ** (المائدہ۔ آیت ۳۹)۔ اسی طرح قرآن صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرتا ہے، رضاعی بیٹی کی حرمت اس استدلال کی رو سے قرآن کے خلاف ہوئی چاہیے۔ قرآن صرف دو بہنوں کے جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ خالہ اور بھانجی، اور پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو جو شخص حرام کہے اس پر قرآن کے خلاف حکم لگانے کا الزام عائد ہونا چاہیے۔ قرآن صرف اُس حالت میں سوتیلی بیٹی کو حرام کرتا ہے جبکہ اُس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پروردش پائی ہو۔ مطلقاً اس کی حرمت خلاف قرآن قرار پانی چاہیے۔ قرآن صرف اُس وقت رہن کی اجازت دیتا ہے

جب کہ آدمی سفر میں ہو اور قرض کی دستاویز لکھنے والا کاتب میسر نہ آئے۔ حضر میں، اور کاتب کے قابل حصول ہونے کی صورت میں رہن کا جواز قرآن کے خلاف ہونا چاہیے۔ قرآن عام لفظوں میں حکم دیتا ہے **وَآشِهْدُوْا إِذَا تَبَأْ يَعْتُمْ** (گواہ بناؤ جب کہ آپس میں خرید و فروخت کرو)۔ اب وہ تمام خرید و فروخت ناجائز ہونی چاہیے جو رات دن ہماری دکانوں پر گواہی کے بغیر ہو رہی ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن پر ایک نگاہ ڈال لینے سے ہی ان لوگوں کے استدلال کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے جو رجم کے حکم کو خلاف قرآن کہتے ہیں۔ نظام شریعت میں نبی کا یہ منصب ناقابل انکار ہے کہ وہ خدا کا حکم پہنچانے کے بعد ہمیں بتائے کہ اس حکم کا منشا کیا ہے، اُس پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے، کن معاملات پر اس کا اطلاق ہو گا، اور کن معاملات کے لیے دوسرا حکم ہے۔ اس منصب کا انکار صرف اصول دین ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس سے اتنی عملی قباحتیں لازم آتی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔

(۸) زنا کی قانونی تعریف میں فقهاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ اس کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ”ایک مرد کا کسی ایسی عورت سے قبل میں مباشرت کرنا جونہ تو اس کے نکاح یا ملک بیمین میں ہو اور نہ اس امر کے شبه کی کوئی معقول وجہ ہو کہ اس نے منکوحہ یہ مملوکہ سمجھتے ہوئے اس سے مباشرت کی ہے“۔ اس تعریف کی رو سے وطی فی الدُّبُرِ، عملِ قومِ لوط، بہائم سے مجامعت وغیرہ، ماہیتِ زنا سے خارج ہو جاتے ہیں اور صرف عورت سے قبل میں مباشرت ہی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جب کہ شرعی حق یا اس کے شبه کے بغیر یہ فعل کیا گیا ہو۔ بخلاف اس کے شافعیہ اس کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں ”شر مگاہ کو ایسی شر مگاہ میں داخل کرنا جو شرعاً حرام ہو مگر طبعاً جس کی طرف رغبت کی جاسکتی ہو“۔ اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے کہ ”شرعی یا اس کے شبه کے بغیر قبل یا دُبُر میں مرد یا عورت سے وطی کرنا“۔ ان دونوں تعریفوں کی رو سے عمل قومِ لوط بھی زنا میں شمار ہو جاتا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں تعریفیں لفظ زنا کے معروف معنوں

سے ہٹی ہوئی ہیں۔ قرآن مجید ہمیشہ الفاظ کو ان کے معروف اور عام فہم معنی میں استعمال کرتا ہے، الا یہ کہ وہ کسی لفظ کو اپنی اصطلاحِ خاص بنارہا ہو، اور اصطلاحِ خاص بنانے کی صورت میں وہ خود اپنے مفہومِ خاص کو ظاہر کر دیتا ہے۔ یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ لفظ زنا کو کسی مخصوص معنی میں استعمال کیا گیا ہو، لہذا اسے معروف معنی ہی میں لیا جائے گا، اور وہ عورت سے فطری مگر ناجائز تعلق تک ہی محدود ہے، شہوت رانی کی دوسری صورتوں تک وسیع نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں یہ بات معلوم ہے کہ عملِ قومِ لوٹ کی سزا کے بارے میں صحابہ کرامؐ کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ اگر اس فعل کا شمار بھی اسلامی اصطلاح کی رو سے زنا میں ہوتا تو ظاہر ہے کہ اختلافِ رائے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

(۹) قانوناً ایک فعلِ زنا کو مستلزم سزا قرار دینے کے لیے صرفِ ادخالِ حشفہ کافی ہے۔ پورا ادخال یا تکمیلِ فعل اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس کے بر عکس اگر ادخالِ حشفہ نہ ہو تو محض ایک بستر پر بیکجا پایا جانا، یا ملا عبّت کرتے ہوئے دیکھا جانا، یا برہنہ پایا جانا کسی کو زانی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اور اسلامی شریعت اس حد تک بھی نہیں جاتی کہ کوئی جوڑا ایسی حالت میں پایا جائے تو اس کا ڈاکٹری معائنہ کراکے زنا کا ثبوت بھم پہنچایا جائے اور پھر اس پر حدِ زنا جاری کی جائے۔ جو لوگ اس طرح کی بے حیائی میں مبتلا پائے جائیں ان پر صرف تعزیر ہے جس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے حاکمِ عدالت خود کرے گا، یا جس کے لیے اسلامی حکومت کی مجلس شوریٰ کوئی سزا تجویز کرنے کی مجاز ہوگی۔ یہ تعزیر اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو دس کوڑوں سے زیادہ نہیں لگائے جاسکتے، کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ **لایجلد فوق عشرہ جلداتِ الالاف حد من حدود اللہ** کی مقرر کردہ حدود کے سوا کسی اور جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں” (بخاری، مسلم، ابو داؤد)۔ اور اگر کوئی شخص پکڑا نہ گیا ہو بلکہ خود نادم ہو کر ایسے کسی قصور کا اعتراض کرے تو اس کے لیے صرف توبہ کی تلقین کافی ہے۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک

شخص نے حاضر ہو عرض کیا کہ ”شہر کے باہر میں ایک عورت سے سب کچھ کر گزرا بجز جماع کے۔ اب حضور ﷺ جو چاہیں مجھے سزادیں“۔ حضرت عمرؓ نے کہا ”جب خدا نے پردہ ڈال دیا تھا تو تو بھی پردہ پڑا رہنے دیتا“۔ نبی ﷺ خاموش رہے اور وہ شخص چلا گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اسے واپس بلایا اور یہ آیت پڑھی **أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِ النَّهَارِ وَزُلْفَامِنَ الَّيْلِ ۖ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُنَ السَّيِّئَاتِ** نماز قائم کر دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، نیکیاں برا یوں کو دور کر دیتی ہیں“ (ہود، آیت ۱۱۲)۔ ایک شخص نے پوچھا ”کیا یہ اسی کے لیے خاص ہے؟“؟ حضور ﷺ نے فرمایا ”نہیں، سب کے لیے ہے۔“ (مسلم، ترمذی، ابو داؤد،نسائی)۔ یہی نہیں بلکہ شریعت اس کو بھی جائز نہیں رکھتی کہ کوئی شخص اگر جرم کی تصریح کے بغیر اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کرے تو کھون لگا کر اس سے پوچھا جائے کہ تو نے کون سا جرم کیا ہے۔ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے“۔ مگر آپ ﷺ نے اس سے نہیں پوچھا کہ تو کس حد کا مستحق ہوا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر وہ شخص پھر اٹھا اور کہنے لگا کہ میں مجرم ہوں مجھے سزادیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”کیا تو نے ابھی ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟“؟ اس نے عرض کیا ”جی ہاں“۔ فرمایا ”بس تو اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا“۔ (بخاری، مسلم، احمد)۔

(۱۰) کسی شخص (مردیا عورت) کو مجرم قرار دینے کے لیے صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ اس سے فعل زنا صادر ہوا ہے، بلکہ اس کے لیے مجرم میں کچھ شرطیں پائی جانی چاہیں۔ یہ شرطیں زنانے میں کسی محس کے معاملے میں اور ہیں، اور زنا بعد احسان کے معاملہ میں اور۔

زنائے محس کے معاملے میں شرط یہ ہے کہ مجرم عاقل وہ بالغ ہو۔ اگر کسی مجنون یا کسی بچے سے یہ فعل سرزد ہو تو وہ حدِ زنا کا مستحق نہیں ہے۔

اور زنا بعد احصان کے لیے عقل اور بلوغ کے علاوہ چند مزید شرطیں بھی ہیں جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ مجرم آزاد ہو۔ اس شرط پر سب کا اتفاق ہے، کیونکہ قرآن خود اشارہ کرتا ہے کہ غلام کو رجم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ابھی یہ بات گزر چکی ہے کہ لوندی اگر نکاح کے بعد زنا کی مر تکب ہو تو اسے غیر شادی شدہ آزاد عورت کی بہ نسبت آدمی سزا دینی چاہیے۔ فقهاء نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کا یہی قانون غلام پر بھی نافذ ہو گا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مجرم با قاعدہ شادی شدہ ہو۔ یہ شرط بھی متفق علیہ ہے، اور اس شرط کی رو سے کوئی ایسا شخص جو ملک یمن کی بنادر تبتخ کر چکا ہو، یا جس کا نکاح کسی فاسد طریقے سے ہوا ہو، شادی شدہ قرار نہیں دیا جائے گا یعنی اس سے اگر زنا کا صدور ہو تو اس کو رجم کی نہیں بلکہ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

تیسرا شرط یہ ہے کہ اس کا مخصوص نکاح ہی نہ ہو اہو بلکہ نکاح کے بعد خلوت صحیح بھی ہو چکی ہو۔ صرف عقد نکاح کسی مرد کو محسن، یا عورت کو محسنة نہیں بنادیتا کہ زنا کے ارتکاب کی صورت میں اس کو رجم کر دیا جائے۔ اس شرط پر بھی اکثر فقهاء متفق ہیں۔ مگر امام ابو حنیفہ اور امام محمد اس میں اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ایک مرد یا ایک عورت کو محسن صرف اسی صورت میں قرار دیا جائے گا جب کہ نکاح اور خلوت صحیح کے وقت زوجین آزاد، بالغ اور عاقل ہوں۔ اس مزید شرط سے جو فرق واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک مرد کا نکاح ایسی عورت سے ہوا ہو جو لوندی ہو، یا نابالغ ہو، یا مجنون ہو، تو خواہ وہ اس حالت میں اپنی بیوی سے لذت اندوز ہو بھی چکا ہو، پھر بھی وہ مر تکب زنا ہونے کی صورت میں رجم کا مستحق نہ ہو گا۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے کہ اگر اس کو اپنے نابالغ یا مجنون یا غلام شوہر سے لذت اندوز ہونے کا موقع مل چکا ہو، پھر

بھی وہ مر تکب زنا ہونے کی صورت میں رجم کی مستحق نہ ہو گی۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی معقول اضافہ ہے جوان دونوں بالغ النظر بزرگوں نے کیا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ مجرم مسلمان ہو۔ اس میں فقهاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی[ؒ]، امام ابو یوسف اور امام احمد اس کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ذمی بھی اگر زنا بعد احسان کا مر تکب ہو گا تو رجم کیا جائے گا۔ لیکن امام ابو حنیفہ اور امام مالک اس امر پر متفق ہیں کہ زنا بعد احسان کی سزا رجم صرف مسلمان کے لیے ہے۔ اس کے دلائل میں سے سب سے زیادہ معقول اور وزنی دلیل یہ ہے کہ ایک آدمی کو سنگسار جیسی خوفناک سزادی بنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل "احسان" کی حالت میں ہو اور پھر بھی زنا کے ارتکاب سے باز نہ آئے۔ احسان کا مطلب ہے "اخلاقی قلعہ بندی"، اور اس کی تکمیل تین حصروں سے ہوتی ہے۔ اولیں حصار یہ ہے کہ آدمی خدا پر ایمان رکھتا ہو، آخرت کی جواب دہی کا قائل ہو اور شریعت خداوندی کو تسلیم کرتا ہو۔ دوسرا حصار یہ ہے کہ وہ معاشرے کا آزاد فرد ہو، کسی دوسرے کی غلامی میں نہ ہو جس کی پابندیاں اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جائز تر ایسا اختیار کرنے میں مانع ہوتی ہیں، اور لاچاری و مجبوری اس سے گناہ کر سکتی ہے، اور کوئی خاندان اسے اپنے اخلاق اور اپنی عزت کی حفاظت میں مدد دینے والا نہیں ہوتا۔ تیسرا حصار یہ ہے کہ اس کا نکاح ہو چکا ہو اور اسے تسلیم نفس کا جائز ذریعہ حاصل ہو۔ یہ تینوں حصار جب پائے جاتے ہوں تب "قلعہ بندی" مکمل ہوتی ہے اور تب ہی وہ شخص بڑا حصار، یعنی خدا اور آخرت اور قانون خداوندی پر ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں یقیناً قلعہ بندی مکمل نہیں ہے اور اس بنا پر فحور کا جرم بھی اُس شدت کو پہنچا ہوا نہیں ہے جو اسے انتہائی سزا کا مستحق بنادے۔ اسی دلیل کی تائید ابن عمرؓ کی وہ روایت کرتی ہے جسے اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اور دارقطنی نے اپنی سُنّت میں نقل کیا ہے کہ من اشہرک بالله فلیس بیحصن جس نے خدا کے ساتھ ثرک کیا وہ محسن نہیں ہے۔ اگر

چہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا ابن عمر نے اس روایت میں نبی ﷺ کا قول نقل کیا ہے یا یہ ان کا اپنا فتویٰ ہے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود اس کا مضمون اپنے معنی کے لحاظ سے نہایت قوی ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہودیوں کے اُس مقدمے سے استدلال کیا جائے جس میں نبی ﷺ نے رجم کا حکم نافذ فرمایا تھا، تو ہم کہیں گے کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُس مقدمے کے متعلق تمام معتبر روایات کو جمع کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نبی ﷺ نے اُن پر اسلام کا ملکی قانون (Law of the Land) نہیں بلکہ ان کا اپنا مذہبی قانون (Personal Law) نافذ فرمایا تھا۔ بخاری و مسلم کی متفقہ روایت ہے کہ جب یہ مقدمہ آپ کے پاس لا یا گیا تو آپ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا کہ ماتجدون فی التوراة فی شان الرجم یا ماتجدون فی کتابکم یعنی ”تمہاری کتاب توراة میں اس کا کیا حکم ہے؟“ پھر جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ ان کے ہاں رجم کا حکم ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا فانِ حکم بیانِ التوراة ”میں وہی فیصلہ کرتا ہوں جو توراة میں ہے۔“ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا اللہم ان اول من احیا امرک اذا ماتوه خداوندا، میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جب کہ انہوں نے اسے مردہ کر دیا تھا۔ (مسلم، ابو داؤد، احمد)

(۱۱) فعل زنا کے مرتكب کو مجرم قرار دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی آزاد مرضی سے یہ فعل کیا ہو۔ جبرا کراہ سے اگر کسی شخص کو اس فعل کے ارتکاب پر مجبور کیا گیا ہو تو وہ نہ مجرم ہے نہ سزا کا مستحق۔ اس معاملے پر شریعت کا صرف یہ عام قاعدہ ہی منطبق نہیں ہوتا کہ ”آدمی جبرا کرائے ہوئے کاموں کی ذمہ داری سے بری ہے“، بلکہ آگے چل کر اسی سورے میں خود قرآن اُن عورتوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے جن کو زنا پر مجبور کیا گیا ہو۔ نیز متعدد احادیث میں تصریح ہے کہ زنا بالجبرا کی صورت میں صرف زانی جابر کو سزادی گئی اور جس پر جبرا کیا گیا تھا اسے چھوڑ دیا گیا۔ ترمذی و ابو داؤد کی روایت ہے کہ

ایک عورت اندر ہیرے میں نماز کے لیے نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو گرا لیا اور زبردستی اس کی عصمت دری کر دی۔ اس کے شور مچانے پر لوگ آگئے اور زانی پکڑا گیا۔ نبی ﷺ نے اس کو رجم کر ادیا اور عورت کو چھوڑ دیا۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص نے ایک لڑکی سے زنا با جبرا کا ارتکاب کیا۔ آپ نے اسے کوڑے لگوانے اور لڑکی کو چھوڑ دیا۔ ان دلائل کی بنا پر عورت کے معاملہ میں تو قانون متفق علیہ ہے۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہوا ہے کہ آیا مرد کے معاملے میں بھی جبر و اکراہ معتبر ہے یا نہیں۔ امام ابو یوسفؓ، امام محمدؓ، امام شافعیؓ اور امام حسن بن صالحؓ کہتے ہیں کہ مرد بھی اگر زنا کرنے پر مجبور کیا گیا ہو تو معاف کیا جائے گا۔ امام زفرؓ کہتے ہیں کہ اسے معاف نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ انتشارِ عضور کے بغیر اس فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتا، اور انتشارِ عضو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی اپنی شہوت اس کی محرك ہوئی تھی۔ امام ابو حنفیؓ کہتے ہیں کہ اگر حکومت یا اس کے کسی حاکم نے آدمی کو زنا پر مجبور کیا ہو تو سزا نہیں دی جائے گی، کیونکہ جب خود حکومت ہی جرم پر مجبور کرنے والی ہو تو اسے سزادینے کا حق نہیں رہتا۔ لیکن اگر حکومت کے سوا کسی اور نے مجبور کیا ہو تو زانی کو سزادی کی جائے گی، کیونکہ ارتکاب زنا بہر حال وہ اپنی شہوت کے بغیر نہ کر سکتا تھا اور شہوت جبراً پیدا نہیں کی جاسکتی۔ ان تینوں اقوال میں سے پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انتشارِ عضو چاہے شہوت کی دلیل ہو مگر رضا و رغبت کی لازمی دلیل نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک ظالم کسی شریف آدمی کو زبردستی پکڑ کر قید کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ایک جوان، خوبصورت عورت کو بھی برہنہ کر کے ایک کمرے میں بند رکھتا ہے اور اسے اس وقت تک رہا نہیں کرتا جب تک کہ وہ زنا کا مر تکب نہ ہو جائے۔ اس حالت میں اگر یہ دونوں زنا کے مر تکب ہو جائیں اور وہ ظالم اس کے چار گواہ بنائے کر انہیں عدالت میں پیش کر دے تو کیا یہ انصاف ہو گا کہ ان کے حالات کو نظر انداز کر کے انہیں سنگسار کر دیا جائے یا ان پر کوڑے بر سائے جائیں؟ اس طرح کے

حالات عقلائی اعادت ممکن ہیں جن میں شہوت لاحق ہو سکتی ہے، بغیر اس کے کہ اس میں آدمی کی رضا و غبت کا دخل ہو۔ اگر کسی شخص کو قید کر کے شراب کے سوا پینے کو کچھ نہ دیا جائے، اور اس حالت میں وہ شراب پی لے تو کیا محض اس دلیل سے اس کو سزا دی جا سکتی ہے کہ حالات تواناقی اُس کے لیے مجبوری کے تھے مگر حلق سے شراب کا گھونٹ وہ اپنے ارادے کے بغیر نہ اتار سکتا تھا؟ جرم کے متحقق ہونے کے لیے محض ارادے کا پایا جانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے آزاد ارادہ ضروری ہے۔ جو شخص زبردستی ایسے حالات میں مبتلا کیا گیا ہو کہ وہ جرم کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو جائے وہ بعض صورتوں میں تو قطعی مجرم نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں اس کا جرم بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔

(۱۲) اسلامی قانون حکومت کے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ زانی اور زانیہ کے خلاف کارروائی کرے اور عدالت کے سوا کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس پر سزا دے۔ اس امر پر تمام امت کے فقهاء کا اتفاق ہے کہ آیتِ زیر بحث میں حکم **فَاجْلِدُوا** (ان کو کوڑے مارو) کے مخاطب عوام نہیں ہیں بلکہ اسلامی حکومت کے حکام اور قاضی ہیں۔ البتہ غلام کے معاملے میں اختلاف ہے کہ اس پر اس کا آقادِ حد جاری کرنے کا مجاز ہے یا نہیں۔ مذہب حنفی کے تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ وہ اس کا مجاز نہیں ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ مجاز ہے۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ آقا کو سرقہ میں ہاتھ کاٹنے کا تحقیق نہیں ہے مگر زنا، قذف اور شراب نوشی پر وہ حد جاری کر سکتا ہے۔

(۱۳) اسلامی قانون زنا کی سزا کو قانونِ مملکت کا ایک حصہ قرار دیتا ہے اس لیے مملکت کی تمام رعایا پر یہ حکم جاری ہو گا خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اس سے امام مالک کے سوا غالباً ائمہ میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ رجم کی سزا غیر مسلموں پر جاری کرنے میں امام ابو حنیفہ کا اختلاف اس بنیاد پر نہیں ہے کہ یہ قانونِ مملکت نہیں ہے، بلکہ اس بنیاد پر ہے کہ ان کے نزدیک رجم کو شرائط میں سے ایک شرط زانی کا پورا محسن

ہونا ہے اور احسان کی تکمیل اسلام کے بغیر نہیں ہوتی، اس وجہ سے وہ غیر مسلم زانی کو رجم کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے امام مالک کے نزدیک اس حکم کے مخاطب مسلمان ہیں نہ کے کافر، اس لیے وہ حد زنا کو مسلمانوں کے شخصی قانون (پرسنل لا) کا ایک جز قرار دیتے ہیں۔ رہاستا من (جو کسی دوسرے ملک سے دارالاسلام میں اجازت لے کر آیا ہو) تو امام شافعیٰ اور امام ابو یوسفؓ کے نزدیک وہ بھی اگر دارالاسلام میں زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ لیکن امام ابو حنیفہؓ اور امام محمدؓ کہتے ہیں کہ ہم اس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔

(۱۲) اسلامی قانون یہ لازم نہیں کرتا کہ کوئی شخص اپنے جرم کا خود اقرار کرے، یا جو لوگ کسی شخص کے جرم زنا پر مطلع ہوں وہ ضرور ہی اس کی خبر حکام تک پہنچائیں۔ البتہ جب حکام اس پر مطلع ہو جائیں تو پھر اس جرم کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا من اتی شیئا من هذة القاذورات فليست تربسته الله فان بدی لنا صفتته اقینا عليه كتاب الله (احکام القرآن، للجحاص)۔ ”تم میں سے جو شخص ان گندے کاموں میں سے کسی کمر تکب ہو جائے تو اللہ کے ڈالے ہوئے پر دے میں چھپا رہے۔ لیکن اگر وہ ہمارے سامنے اپنا پردہ کھولے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا قانون نافذ کر کے چھوڑ دیں گے“۔ ابو داؤد میں ہے کہ ماعز بن مالک اسلامی سے جب زنا کا جرم سرزد ہو گیا تو ہرزال بن نعیم نے ان سے کہا کہ جا کر نبی ﷺ کے سامنے اپنے اس جرم کا اقرار کرو۔ چنانچہ انہوں نے جا کر حضور ﷺ سے اپنا جرم بیان کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے ایک طرف تو انہیں رجم کی سزا دی اور دوسری طرف ہرزال سے فرمایا لوسترته بشوبك كان خيرالله ”کاش تم اس کا پردہ ڈھانک دیتے تو تمہارے لیے زیادہ اچھا تھا“۔ ابو داؤد اور نسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تعافوا الحدود في ما يينكم فيما

بلغنى من حد فقد وجب ”حدود کو آپس ہی میں معاف کر دیا کرو۔ مگر جس حد (یعنی جرم مستلزم حد) کا معاملہ مجھ تک پہنچ جائے گا پھر وہ واجب ہو جائی گی“۔

(۱۵) اسلامی قانون میں یہ جرم قابل راضی نامہ نہیں ہے۔ قریب قریب تمام کتب حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک لڑکا ایک شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مر تکب ہو گیا۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لوندی دے کر اس شخص کو راضی کیا۔ مگر جب یہ مقدمہ نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا **اما غنیم و جاریتك فر د علیك** ”تیری بکریاں اور تیری لوندی تجھی کو واپس“، اور پھر آپ ﷺ نے زانی اور زانیہ دونوں پر حد جاری فرمادی۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اس جرم میں راضی نامہ کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں عصموں کا معاوضہ مالی تاوانوں کی شکل میں نہیں دلوایا جاسکتا۔ آبرو کی قیمت کا یہ دیوثانہ تصور مغربی قوانین ہی کو مبارک رہے۔

(۱۶) اسلامی حکومت کسی شخص کے خلاف زنا کے جرم میں کوئی کارروائی نہ کرے گی جب تک کہ اس کے جرم کا ثبوت نہ مل جائے۔ ثبوت جرم کے بغیر کسی کی بد کاری خواہ کتنے ہی ذرائع سے حکام کے علم میں ہو، وہ بہر حال اس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔ مدینے میں ایک عورت تھی جس کے متعلق روایات ہیں کہ وہ کھلی فاحشہ تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے **كانت تظهرى لالإسلام السوء** دوسری روایت میں ہے **كانت قد اعلنت في الإسلام ابن ماجه** کی روایت ہے **فقد ظهر منها الريبة في منطقها و هيئتها و من يدخل عليها** لیکن چونکہ اس کے خلاف بد کاری کا ثبوت نہ تھا اس لیے اسے کوئی سزا نہ دی گئی، حالانکہ اس کے متعلق نبی ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ تک نکل گئے تھے کہ **لو كنْت راجِحاً أَحَدًا بِغَيْرِ بِينَةٍ لَرْجُتَهَا** اگر میں ثبوت کے بغیر رجم کرنے والا ہو تو اس عورت کو ضرور رجم کر دیتا۔“۔

(۱۷) جرم زنا کا پہلا ممکن ثبوت یہ ہے کہ شہادت اس پر قائم ہو۔ اس کے متعلق قانون کے اہم اجزاء یہ ہیں: الف۔ قرآن تصریح کرتا ہے کہ زنا کے لیے کم سے کم چار عین شاہد ہونے چاہیے۔ اس کی صراحت سورہ نساء آیت ۱۵ میں بھی گزر چکی ہے اور آگے اسی سورہ نور میں بھی دو جگہ آرہی ہے۔ شہادت کے بغیر قاضی محض اپنے علم کی بناء پر فیصلہ نہیں کر سکتا خواہ وہ اپنی آنکھوں سے ارتکاب جرم ہوتے دیکھ چکا ہو۔

ب۔ گواہ ایسے لوگ ہونے چاہیے جو اسلامی قانون شہادت کی رو سے قابل اعتماد ہوں۔ مثلاً یہ کہ وہ پہلے کسی مقدمے میں جھوٹے گواہ ثابت نہ ہو چکے ہوں، خائن نہ ہوں، پہلے کے سزا یافتہ نہ ہوں، ملزم سے ان کی دشمنی ثابت نہ ہو، وغیرہ۔ بہر حال ناقابل اعتماد شہادت کی بناء پر نہ تو کسی کو رجم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کی پیڑھے پر کوڑے بر سائے جاسکتے ہیں۔

ج۔ گواہوں کو اس بات کی شہادت دینی چاہیے کہ انہوں نے ملزم اور ملزم کو عین حالتِ مباشرت میں دیکھا ہے، یعنی **کالمیل فی المکحلاة والرشاع فی البئر** (اس طرح جیسے سرمه دانی میں سلامی اور کنوئیں میں رسی)۔ د۔ گواہوں کو اس امر میں متفق ہونا چاہیے کہ انہوں نے کب، کہاں، کس کو، کس سے زنا کرتے دیکھا ہے۔ ان بنیادی امور میں اختلاف ان کی شہادت کو ساقط کر دیتا ہے۔

شہادت کی یہ شرائط خود ظاہر کر رہی ہیں کہ اسلامی قانون کا منشایہ نہیں ہے کہ ٹکٹکیاں لگی ہوں اور روز لوگوں کی پیڑھوں پر کوڑے برستے رہیں۔ بلکہ وہ ایسی حالت ہی میں یہ سخت سزاد دیتا ہے کہ جبکہ تمام اصلاحی اور انسدادی تدابیر کے باوجود اسلامی معاشرے میں کوئی جوڑا ایسا بے حیا ہو کہ چار چار آدمی اس کو جرم کرتے دیکھ لیں۔

(۱۸) اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا محض حمل کا پایا جانا، جبکہ عورت کو کوئی شوہر، یا لونڈی کا کوئی آقا معلوم و معروف نہ ہو، ثابت زنا کے لیے کافی شہادت بالقرینہ ہے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی

شہادت ہے اور اسی کو مالکیہ نے اختیار کیا ہے۔ مگر جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ محض حمل اتنا مضبوط قرینہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر کسی کو رجم کر دیا جائے یا کسی کی پیٹھ پر سو کوڑے بر سادیے جائیں۔ اتنی بڑی سزا کے لیے ناگزیر ہے کہ یا تو شہادت موجود ہو، یا پھر اقرار۔ اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ شبہ سزادینے کے لیے نہیں بلکہ معاف کرنے کے لیے محرک ہونا چاہیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ ادفعوا الحدود ما وجدتم لها مدفعاً "سزاوں کو دفع کرو جہاں تک بھی ان کو دفع کرنے کی گنجائش پاؤ" (ابن ماجہ)۔ ایک دوسری حدیث میں ہے ادروءا الحدود عن المسلمين ما استطعتم فان كان له مخرج فخلوا سبيله، فان الامام ان يخطئ في العفو خير من ان يخطئ في العقوبة "مسلمانوں سے سزاوں کو دور کرو جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اگر کسی ملزم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزادینے میں غلطی کر جائے" (ترمذی)۔ اس قاعدے کے لحاظ سے حمل کی موجودگی، چاہے شبہ کے لیے کتنی ہی قوی بنیاد ہو، زنا کا یقینی ثبوت بہر حال نہیں ہے، اس لیے کہ لاکھ میں ایک درجے کی حد تک اسامر کا بھی امکان ہے کہ مباشرت کے بغیر کسی عورت کے رحم میں کسی مرد کے نطفے کا کوئی جز پہنچ جائے اور وہ حاملہ ہو جائے اتنے خفیف شبہ کا امکان بھی اس کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ ملزمہ کو زنا کی ہولناک سزا سے معاف رکھا جائے۔

(۱۹) اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ اگر زنا کے گواہوں میں اختلاف ہو جائے، یا اور کسی وجہ سے ان کی شہادتوں سے جرم ثابت نہ ہو تو کیا اُلطے گواہ جھوٹے الزام کی سزا پائیں گے؟ فقہاء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس صورت میں وہ قاذف قرار پائیں گے اور انہیں ۸۰ کوڑوں کی سزادی جائے گی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ وہ گواہ کی حیثیت سے آئے ہیں نہ کہ مدعی کی حیثیت سے۔ اور اگر اس طرح گواہوں کو سزادی جائے تو پھر زنا کی شہادت بھم پہنچانے کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ آخر کس کی

شامت نے دھکا دیا ہے کہ سزا کا خطرہ مول لے کر شہادت دینے آئے جبکہ اس امر کا یقین کسی کو بھی نہیں ہو سکتا کہ چاروں گواہوں میں سے کوئی ٹوٹ نہ جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہی دوسرا رائے معقول ہے، کیونکہ شبہ کا فائدہ جس طرح ملزم کو ملنا چاہیے، اسی طرح گواہوں کو بھی ملنا چاہیے۔ اگر ان کی شہادت کی کمزوری اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ملزم کو زنا کی خوفناک سزادے ڈالی جائے، تو اسے اس بات کے لیے بھی کافی نہ ہونا چاہیے کہ گواہوں پر قذف کی خوفناک سزا بر سادی جائے، اُلا یہ کہ ان کا صریح جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے۔ پہلے قول کی تائید میں دو بڑی دلیلیں دی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ قرآن زنا کی جھوٹی تہمت کو مستوجب سزا قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ دلیل اس لیے غلط ہے کہ قرآن خود قاذف (تہمت لگانے والے) اور شاہد کے درمیان فرق کر رہا ہے، اور شاہد مغض اس پنا پر قاذف قرار نہیں پاسکتا کہ عدالت نے اس کی شہادت کو ثبوتِ جرم کے لیے کافی نہیں پایا۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مُغِیرَةُ بْنُ شُعْبَةَ کے مقدمے میں حضرت عمرؓ نے ابو بکرؓ اور ان کے دو ساتھی شاہدوں کو قذف کی سزادی تھی۔ لیکن اس مقدمے کی پوری تفصیلات دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نظیر ہر اس مقدمے پر چسپاں نہیں ہوتی جس میں ثبوت جرم کے لیے شہادتیں ناکافی پائی جائیں۔ مقدمے کے واقعات یہ ہیں کہ بصرے کے گورنر مُغِیرَةُ بْنُ شُعْبَةَ سے ابو بکرؓ کے تعلقات پہلے سے خراب تھے۔ دونوں کے مکان ایک ہی سڑک پر آمنے سامنے واقع تھے۔ ایک روز یک ایک ہوا کے زور سے دونوں کے کمروں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ ابو بکرؓ اپنی کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھے تو ان کی نگاہ سامنے کے کمرے پر پڑی اور انہوں نے حضرت مغیرہ کو مباشرت میں مشغول دیکھا۔ ابو بکرؓ کے پاس ان کے تین دوست (نافع بن گلَّدَه، زیاد، اور شبل بن معبد) بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آؤ، دیکھو اور گواہ رہو کہ مغیرہ کیا کر رہے ہیں۔ دوستوں نے پوچھا یہ عورت کون ہے۔ ابو بکرؓ نے کہا اُم جمیل۔ دوسرے روز اس کی شکایت حضرت عمرؓ کی پاس بھیجی گئی۔ انہوں نے فوراً حضرت مغیرہ کو معطل کر

کے حضرت ابو موسیٰ اشتریؓ کو بصرے کا گورنر مقرر کیا اور ملزم کو گواہوں سمیت مدینے طلب کر لیا۔ پیشی پر ابو بکرؓ اور دو گواہوں نے کہا کہ ہم نے مغیرہ کو ام جمیل کے ساتھ بالفعل مباشرت کرتے دیکھا۔ مگر زیاد نے کہا کہ عورت صاف نظر نہیں آتی تھی اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ام جمیل تھی۔ مغیرہ بن شعبہ نے جرح میں یہ ثابت کر دیا کہ جس رُخ سے یہ لوگ انہیں دیکھ رہے تھے اس سے دیکھنے والا عورت کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ ان کی بیوی اور ام جمیل باہم بہت مشابہ ہیں۔

قرائن خود بتارہ ہے تھے کہ حضرت عمرؓ کی حکومت میں ایک صوبے کا گورنر، خود اپنے سرکاری مکان میں، جہاں اس کی بیوی اس کے ساتھ رہتی تھی، ایک غیر عورت کو بلا کر زنا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ابو بکرؓ اور ان کے ساتھیوں کا یہ سمجھنا کہ مغیرہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے بجائے ام جمیل سے مباشرت کر رہے ہیں، ایک نہایت بے جا بدگمانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے صرف ملزم کو بری کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ابو بکرؓ، نافع اور شبل پر حذف قذف بھی جاری فرمائی۔ یہ فیصلہ اس مقدمے کے مخصوص حالات کی بناء پر تھا نہ کہ اس قاعدہ کلیہ کی بناء پر کہ جب کبھی شہادتوں سے جرم زنا ثابت نہ ہو تو گواہ ضرور پیٹ ڈالے جائیں۔ (مقدمے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو احکام القرآن ابن العربي، جلد ۲، صفحہ ۸۸)

(۲۰) شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ یہ اقرار صاف اور صریح الفاظ میں فعل زنا کے ارتکاب کا ہونا چاہیے، یعنی اسے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے ایک ایسی عورت سے جو اس کے لیے حرام تھی **کالبیل فی البکحلة** یہ فعل کیا ہے۔ اور عدالت کو پوری طرح یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ مجرم کسی خارجی دباؤ کے بغیر بطورِ خود بحالتِ ہوش و حواس یہ اقرار کر رہا ہے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ایک اقرار کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہیے (یہ امام ابو حنفیہ،

(۲۱) شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ یہ اقرار صاف اور صریح الفاظ میں فعل زنا کے ارتکاب کا ہونا چاہیے، یعنی اسے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے ایک ایسی عورت سے جو اس کے لیے حرام تھی **کالبیل فی البکحلة** یہ فعل کیا ہے۔ اور عدالت کو پوری طرح یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ مجرم کسی خارجی دباؤ کے بغیر بطورِ خود بحالتِ ہوش و حواس یہ اقرار کر رہا ہے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ایک اقرار کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہیے (یہ امام ابو حنفیہ،

امام احمد^{رض}، ابن ابی لیلیا، اسحاق بن راہویہ اور حسن بن صالح کا مسلک ہے)۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک ہی اقرار کافی ہے (امام مالک^{رض}، امام شافعی^{رض}، عثمان البشیری اور حسن بصری^{رض} وغیرہ اس کے قائل ہیں)۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ کسی دوسرے تائیدی ثبوت کے بغیر صرف مجرم کے اپنے ہی اقرار پر فیصلہ کیا گیا ہو تو اگر عین سزا کے دوران میں بھی مجرم اپنے اقرار سے پھر جائے تو سزا کو روک دینا چاہیے، خواہ یہ بات صریح گا ہی کیوں نہ ظاہر ہو رہی ہو کہ وہ مار کی تکلیف سے بچنے کے لیے اقرار سے رجوع کر رہا ہے۔ اس پورے قانون کا مأخذ وہ نظائر ہیں جو زنا کے مقدمات کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا مقدمہ عزیز بن مالک اسلامی کا ہے جسے متعدد صحابہ^{رض} سے بکثرت راویوں نے نقل کیا ہے اور قریب قریب تمام کتب حدیث میں اس کی روایات موجود ہیں۔ یہ شخص قبیلہ اسلم کا ایک یتیم لڑکا تھا جس نے حضرت ہزار بن نعیم کے ہاں پرورش پائی تھی۔ یہاں وہ ایک آزاد کردہ لوئڈی سے زنا کر بیٹھا۔ حضرت ہزار نے کہا کہ جا کر بنی صالح^{علیہ السلام} کو اپنے اس گناہ کی خبر دے، شاید کہ آپ صالح^{علیہ السلام} تیری لیے دعائے مغفرت فرمادیں۔ اس نے حضور صالح^{علیہ السلام} سے کہا یا رسول اللہ صالح^{علیہ السلام} سے مجھے پاک کر دیجیے، میں نے زنا کی ہے۔ آپ صالح^{علیہ السلام} نے منه پھیر لیا اور فرمایا **ویحک ارجع فاستغفر اللہ وتب الیه** ”ارے، چلا جا اور اللہ سے توبہ و استغفار کر۔“ مگر اس نے پھر سامنے آ کر وہی بات کہی اور آپ صالح^{علیہ السلام} نے پھر منه پھیر لیا۔ اس نے تیسرا بار وہی بات کہی اور آپ صالح^{علیہ السلام} نے پھر منه پھیر لیا۔ حضرت ابو بکر^{رض} نے اس کو متنبہ کیا کہ دیکھ، اب چو تھی بار اگر تو نے اقرار کیا تو رسول اللہ صالح^{علیہ السلام} تھے رجم کرادیں گے۔ مگر وہ نہ مانا اور پھر اس نے اپنی بات دُھرائی۔ اب حضور صالح^{علیہ السلام} اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فرمایا **لعدک قبلت او غیزت او نظرت** شاید تو نے بوس و کنار کیا ہو گا یا چھیڑ چھاڑی کی ہو گی یا نظر بد ڈالی ہو گی“ (اور تو سمجھ بیٹھا ہو گا کہ یہ زنا کا ارتکاب ہے)۔ اس نے کہا نہیں۔ آپ صالح^{علیہ السلام} نے پوچھا ”کیا تو اس سے ہم بستر ہووا؟“ اس نے کہا ہاں۔ پھر پوچھا ”کیا تو نے اس

سے مبادرت کی؟“ اُس نے کہا ہاں۔ پھر پوچھا ”کیا تو نے اس سے مجامعت کی؟“ اس نے کہا ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے وہ لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں خاص فعل مبادرت ہی کے لیے بولا جاتا ہے، اور یہ نخش لفظ حضور ﷺ کی زبان سے نہ پہلے کبھی سنا گیا نہ اس کے بعد کسی نے سنا۔ اگر ایک شخص کی جان کا معاملہ نہ ہوتا تو زبان مبارک سے کبھی ایسا لفظ نہ نکل سکتا تھا۔ مگر اس نے اس کے جواب میں بھی ہاں کہہ دیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا حتیٰ غاب ذلك منك في ذلك منها (کیا اس حد تک کہ تیری وہ چیز اس کی اُس چیز میں غائب ہو گئی؟)۔ اس نے کہا ہاں۔ پھر، پوچھا کمایغیب البیل فی المکحلاة والرشاع فی البیر (کیا اس طرح غائب ہو گئی جیسے سرمه دانی میں سلانی اور کنوئیں میں رسی؟) اس نے کہا ہاں۔ پوچھا ”کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟“ اس نے کہا ”جی ہاں، میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا جو شہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔“ آپ ﷺ نے پوچھا ”کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟“ اس نے کہا ”جی ہاں۔“ آپ ﷺ نے پوچھا ”تو نے شراب تو نہیں پی لی ہے؟“ اس نے کہا نہیں۔ ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے محلہ والوں سے دریافت کیا کہ یہ دیوانہ تو نہیں ہے؟ انہوں نے کہا ہم نے اس کی عقل میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ آپ ﷺ نے ہزار سے فرمایا لو ستتھ بثوبک کان خیراللک، کاش تم نے اس کا پرده ڈھانک دیا ہوتا تو تمہارے لیے اچھا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ماعز کو رجم کرنے کا فیصلہ صادر فرمادیا اور اسے شہر کے باہر لے جا کر سنگسار کر دیا گیا۔ جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو ماعز بھاگا اور اس نے کہا ”لوگو، مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس لے چلو، میرے قبلے کے لوگوں نے مجھے مر وا دیا۔ انہوں نے مجھے دھوکا دیا کہ رسول اللہ مجھے قتل نہیں کرائیں گے۔“ مگر مارنے والوں نے اسے مار ڈالا۔ بعد میں جب حضور ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ

نے فرمایا ”تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا، میرے پاس لے آئے ہوتے، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔“

دوسراؤاقعہ غامدیہ کا ہے جو قبیلہ غامد (قبیلہ جہینہ کی ایک شاخ) کی عورت تھی۔ اُس نے بھی آکر چار مرتبہ اقرار کیا کہ وہ زنا کی مر تکب ہوئی ہے اور اسے ناجائز حمل ہے۔ آپ ﷺ نے اُس سے بھی پہلے اقرار پر فرمایا **وَيَحْكُمْ أَنْ يَرْجِعُ إِلَى اللَّهِ وَتُوبَ إِلَيْهِ** (”اری چلی جا، اللہ سے معافی مانگ اور توبہ کر“)۔ مگر اس نے کہا ”یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ ﷺ نے مجھے ماعز کی طرح ٹالنا چاہتے ہیں۔ میں زنا سے حاملہ ہوں۔“۔ یہاں چونکہ اقرار کے ساتھ حمل بھی موجود تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اُس قدر مفصل جرجنہ فرمائی جو ماعز کے ساتھ کی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”اچھا، نہیں مانتی توجا، وضع حمل کے بعد آئیو“۔ وضع حمل کے بعد وہ بچے کے لے کر آئی اور کہا اب مجھے پاک کر دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”جا اور اس کو دودھ پلا۔ دودھ چھوٹنے کے بعد آئیو“۔ پھر وہ دودھ چھٹانے کے بعد آئی اور ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی لیتی آئی۔ بچے کو روٹی کا ٹکڑا اکھلا کر حضور ﷺ کو دکھایا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اب اس کا دودھ چھوٹ گیا ہے اور دیکھیے یہ روٹی کھانے لگا ہے۔ تب آپ ﷺ نے بچے کو پروردش کے لیے ایک شخص کے حوالے کیا اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

ان دونوں واقعات میں بصراحت چار اقراروں کا ذکر ہے۔ اور ابو داؤد میں حضرت بُرَيْدَةَ کی روایت ہے کہ صحابہؓ کرام کا عام خیال یہی تھا کہ اگر ماعز اور غامدیہ چار مرتبہ اقرار نہ کرتے تو انہیں رجم نہ کیا جاتا۔ البتہ تیسرا واقعہ (جس کا ذکر ہم اوپر نمبر ۱۵ میں کر چکے ہیں) اس میں صرف یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ”جا کر اس کی بیوی سے پوچھ، اور اگر وہ اعتذاف کرے تو اسے رجم کر دے“۔ اس میں چار اعتذافوں کا ذکر نہیں ہے، اور اسی سے فقہاء کے ایک گروہ نے استدلال کیا ہے کہ ایک ہی اعتذاف کافی ہے۔

(۲۱) اور ہم نے جن تین مقدمات کی نظیریں پیش کی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اقراری مجرم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے کس سے زنا کا مرتكب کیا ہے، کیونکہ اس طرح ایک کے بجائے دو کو سزادینی پڑے گی، اور شریعت لوگوں کو سزا نہیں دینے کے لیے بے چین نہیں ہے۔ البتہ اگر مجرم خود یہ بتائے کہ اس فعل کا فریق ثانی فلاں ہے تو اس سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ بھی اعتراف کرے تو اسے سزادی جائے گی۔ لیکن اگر وہ انکار کر دے تو صرف اقراری مجرم ہی حد کا مستحق ہو گا۔ اس امر میں فقهاء کا اختلاف ہے کہ اس دوسری صورت میں (یعنی جبکہ فریق ثانی اس کے ساتھ مرتكب زنا ہونے کو تسلیم نہ کرے) اُس پر آیا حد زنا جاری کی جائے گی یا حد قذف۔ امام مالک[ؓ] اور امام شافعی[ؓ] کے نزدیک وہ حد زنا کا مستوجب ہے، کیونکہ اسی جرم کا اس نے اقرار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام اوzaعی کی رائے میں اس پر حد قذف جاری کی جائے گی، کیونکہ فریق ثانی کے انکار نے اس کے جرم زنا کو مشکوک کر دیا ہے، البتہ اس کا جرم قذف بہر حال ثابت ہے۔ اور امام محمد کا فتویٰ یہ ہے (امام شافعی[ؓ] کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے) کہ اسے زنا کی سزا بھی دی جائے گی اور قذف کی بھی، کیونکہ اپنے جرم زنا کا وہ خود معترض ہے، اور فریق ثانی پر اپنا الزام وہ ثابت نہیں کر سکا ہے۔ نبی ﷺ کی عادلت میں اس قسم کا ایک مقدمہ آیا تھا۔ اس کی ایک روایت جو مسند احمد اور ابو داؤد میں سہل بن سعد سے منقول ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: ”ایک شخص نے آکر نبی ﷺ کے سامنے اقرار کیا کہ وہ فلاں عورت سے زنا کا مرتكب ہوا ہے۔ آپ نے عورت کو بلا کر پوچھا۔ اس نے انکار کیا۔ آپ ﷺ نے اس پر حد جاری کی اور عورت کو چھوڑ دیا۔“ اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ کوئی حد جاری کی۔ دوسری روایت ابو داؤد اور نسائی نے ابن عباس[ؓ] سے نقل کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ پہلے اس کے اقرار پر آپ ﷺ نے حد زنا جاری کی، پھر عورت سے پوچھا اور اس کے انکار پر اس شخص کو حد قذف کے کوڑے لگوائے۔ لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کے ایک راوی قاسم بن

فیاض کو متعدد محمد شین نے ساقط الاعتبار ٹھیرا یا ہے، اور قیاس کے بھی خلاف ہے، اس لیے نبی ﷺ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ آپ ﷺ نے اسے کوڑے لگوانے کے بعد عورت سے پوچھا ہو گا۔ صریح عقل اور انصاف کا تقاضا، جسے حضور ﷺ نظر انداز نہیں فرمائتے تھے، یہ تھا کہ جب اس نے عورت کا نام لے دیا تھا تو عورت سے پوچھئے بغیر اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ کیا جاتا۔ اسی کی تائید سہل بن سعد والی روایت بھی کر رہی ہے۔ الہذا دوسرا روایت لاکن اعتماد نہیں ہے۔

(۲۲) ثبوت جرم کے بعد زانی اور سرزانیہ کو کیا سزادی جائے گی، اس مسئلے میں فقهاء کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے، مختلف فقهاء کے مسلک اس باب میں حسب ذیل ہیں:
شادی شدہ مرد عورت کے لیے زنا کی سزا:
——— امام احمد^{رض}، داؤد ظاہر اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک سو کوڑے لگانا اور اس کے بعد سنگسار کرنا ہے۔
——— باقی تمام فقهاء اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی سزا صرف سنگساری ہے۔ رجم اور سزاۓ تازیانہ کو جمع نہیں کیا جائے گا۔

غیر شادی شدہ کی سزا:
——— امام شافعی^{رض}، امام احمد، اسحاق، داؤد ظاہری، سفیان ثوری، ابن ابی لیلی اور حسن بن صالح کے نزدیک سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی، مرد عورت ہر دو کے لیے۔
——— امام مالک^{رض} اور اوزاعی کے نزدیک مرد کے لئے ۱۰۰ کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی۔ اور عورت کے لئے صرف سو کوڑے۔

(جلاء طنی سے مراد ان سب کے نزدیک یہ ہے کہ مجرم کو اس کی بستی سے نکال کر کم از کم اتنے فاصلے پر بھیج دیا جائے جس پر نماز میں قصر واجب ہوتا ہے۔ مگر زید بن علیؑ اور امام جعفر صادقؑ کے نزدیک قید کر دینے سے بھی جلاء طنی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے)۔

-----امام ابو حنیفہؓ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسف، امام زفر اور امام محمدؓ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حد زنا مر اور عورت دونوں کے لیے صرف سو کوڑے ہے۔ اس پر کسی اور سزا، مثلاً قید یا جلاء طنی کا اضافہ حد نہیں بلکہ تعزیر ہے۔ قاضی اگر یہ دیکھے کہ مجرم بد چلن ہے، یا مجرم اور مجرمہ کے تعلقات بہت گہرے ہیں تو حسب ضرورت وہ انہیں خارج البلد بھی کر سکتا ہے اور قید بھی کر سکتا ہے۔

(حد اور تعزیر میں فرق یہ ہے کہ حد ایک مقرر سزا ہے جو ثبوت جرم کی شراط پوری ہونے کے بعد لازمًا دی جائے گی تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بحاظ مقدار و نوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو، بلکہ جس میں عدالت حالات مقدمہ کے لحاظ سے کم بیشی کر سکتی ہو)۔

ان مختلف مسالک میں سے ہر ایک نے مختلف احادیث کا سہارا لیا ہے جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت، جسے مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور امام احمد نے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا خذ واعنی خذ واعنی، قد جعل اللہ لہن سبیلا، البکر بالبکر جلد مأة و تعریب عام و الشیب بالشیب جلد مأة والرجم (اور می بالحجارة۔ اور جم بالحجارة)"مجھ سے لو، مجھ سے لو، اللہ نے زانیہ عورتوں کے لیے طریقہ مقرر کر دیا۔ غیر شادی شدہ مرد کی غیر شادی شدہ عورت سے بد کاری کے لیے سو کوڑے اور سنگساری" (یہ حدیث اگرچہ سندًا صحیح ہے، مگر روایات صحیحہ کا ایک جم غیرہ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ اس پر نہ عہد نبوی میں کبھی عمل ہوا، نہ عہد خلفائے راشدین میں، اور نہ فقهاء میں سے کسی نے

ٹھیک اس کے مضمون کے مطابق فتویٰ دیا۔ فقه اسلامی میں جو بات متفق علیہ ہے وہ یہ ہے کہ زانی اور زانیہ کے محسن اور غیر محسن ہونے کا الگ الگ اعتبار کیا جائے گا۔ غیر شادی شدہ مرد خواہ شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا غیر شادی شدہ ہر دو حالتوں میں اس کو ایک ہی سزادی جائے گی۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے۔ وہ شادی شدہ ہو تو ہر حالت میں ایک ہی سزا پائے گی خواہ اس سے زنا کرنے والا مرد شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور باکرہ ہونے کی صورت میں بھی اس کے لیے ایک ہی سزا ہے بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ساتھ زنا کرنے والا محسن ہے یا غیر محسن)۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت زید بن خالد جہنیؓ کی روایت، جسے بخاری، مسلم ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد نے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ دو اعرابی نبی ﷺ کے پاس مقدمہ لائے۔ ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا تھا۔ وہ اس کی بیوی سے ملوث ہو گیا۔ میں نے اس کو سو بکریاں اور ایک لوٹی دے کر راضی کیا۔ مگر اہل علم نے بتایا کہ یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمادیں اور دوسرے نے بھی کہا کہ آپ کتاب اللہ مطابق فیصلہ فرمادیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں کتاب اللہ ہی کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ بکریاں اور لوٹی تجھی کو واپس۔ تیرے بیٹے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی۔ پھر آپ نے قبیلہ اسلام کے ایک شخص سے فرمایا اسے انیس، تو جا کر اس کی بیوی سے پوچھ۔ اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔ چنانچہ اس نے اعتراف کیا اور رجم کر دی گئی۔ (اس میں رجم سے پہلے کوڑے لگانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور غیر شادی شدہ مرد کو شادی شدہ عورت سے بدکاری کرنے پر تازیانے اور جلاوطنی کی سزادی گئی ہے)۔

ماعز اور غامدیہ کے مقدمات کی جتنی رو دادیں احادیث کی مختلف کتابوں میں مروی ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ملتا کہ حضور ﷺ نے رجم کرانے سے پہلے ان کو سو کوڑے بھی لگوانے ہوں۔

کوئی روایت کسی حدیث میں نہیں ملتی کہ نبی ﷺ نے کسی مقدمے میں رجم کے ساتھ سزاۓ تازیانہ کا بھی فیصلہ فرمایا ہو۔ زنا بعد احسان کے تمام مقدمات میں آپ نے صرف رجم کی سزادی ہے۔

حضرت عمرؓ کا مشہور خطبہ جس میں انہوں نے پورے زور سے ساتھ زنا بعد احسان کی سزا رجم بیان کی ہے، بخاری و مسلم اور ترمذی ونسائی نے مختلف سندوں سے نقل کیا ہے اور امام احمد نے بھی اس کی متعدد روایتیں لی ہیں، مگر اس کی کسی روایت میں بھی رجم مع سزاۓ تازیانہ کا ذکر نہیں ہے۔

خلافے راشدین میں سے صرف حضرت علیؓ نے سزاۓ تازیانہ اور سنگساری کو ایک سزا میں جمع کیا ہے۔ امام احمد اور بخاری عمر شعبی سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت شراحہ نامی نے ناجائز حمل کا اعتراف کیا، حضرت علیؓ نے جمعرات کے روز اسے کوڑے لگوانے اور جمعہ کے روز اس کو رجم کرایا، اور فرمایا ہم نے اسے کتاب اللہ کے مطابق کوڑے لگائے ہیں اور سنت رسول اللہ کے مطابق سنگسار کرتے ہیں۔ اس ایک واقعہ کے سوا عہد خلافت راشدہ کا کوئی دوسرا واقعہ رجم مع تازیانہ کے حق میں نہیں ملتا۔

جابر بن عبد اللہ کی ایک روایت، جسے ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے، یہ بتاتی ہے کہ ایک شخص زنا کا مر تکب ہوا اور نبی ﷺ نے اس کو صرف سزاۓ تازیانہ دی، پھر معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ تھا، تب آپ نے اسے رجم کرایا۔ اس کے علاوہ متعدد روایات ہم پہلے نقل کر آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیوں کو آپ ﷺ نے صرف سزاۓ تازیانہ دی، مثلاً وہ شخص جس نے نماز کے لیے جاتی ہوئی عورت سے زنا باجر کی تھی، اور وہ شخص جس نے زنا کا اعتراف کیا اور عورت نے انکار کیا۔

حضرت عمرؓ نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شراب نوشی کے جرم میں جلاوطن کیا اور وہ بھاگ کر رومیوں سے جاملا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آئندہ میں کسی کو جلاوطنی کی سزا نہیں دوں گا۔ اسی طرح حضرت علیؓ

نے غیر شادی شدہ مرد و عورت کو زنا کے جرم میں جلا وطن کرنے سے نکار کر دیا، اور فرمایا کہ اس میں فتنے کا اندریشہ ہے (احکام القرآن، جصاص، جلد 3، صفحہ 315)۔

ان تمام روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کی اصحاب کا مسلک ہی صحیح ہے، یعنی زنا بعد احسان کی حد صرف رجم ہے، اور محض زنا کی حد صرف 100 کوڑے۔ تازیانے اور رجم کو جمع کرنے کرنے پر تو عہد نبوی سے لے کر عہد عثمانی تک کبھی عمل ہی نہیں ہوا۔ رہا تازیانے اور جلا وطنی کو جمع کرنا، تو اس پر کبھی عمل ہوا ہے اور کبھی نہیں ہوا۔ اس سے مسلک حنفی کی صحت صاف ثابت ہو جاتی ہے۔

(۲۳): ضرب تازیانہ کی کیفیت کے متعلق پہلا اشارہ خود قرآن کے لفظ: **فَاجْلُوْدَا** میں ملتا ہے۔ جلد کا لفظ جلد (یعنی کھال) سے مخوذ ہے۔ اس سے تمام اہل لغت اور علمائے تفسیر نے یہی معنی لیے ہیں کہ مارا یہی ہونی چاہیے جس کا اثر جلد تک رہے، گوشت تک نہ پہنچے۔ ایسی ضرب تازیانہ جس سے گوشت کے ٹکڑے اڑ جائیں، یا کھال پھٹ کر اندر تک زخم پڑ جائے، قرآن کے خلاف ہے۔

مار کے لیے خواہ کوڑا استعمال کیا جائے یا بید، دونوں صورتوں میں وہ او سط درجے کا ہونا چاہیے۔ نہ بہت موٹا اور سخت۔ اور نہ بہت پتلا اور نرم۔ موٹا میں امام مالک^{رحمۃ اللہ علیہ} کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ضرب تازیانہ کے لیے کوڑا طلب کیا اور وہ کثرت استعمال سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **فوق هذَا** (اس سے زیادہ سخت لاو)۔ پھر ایک نیا کوڑا لایا گیا، جو ابھی استعمال سے نرم نہیں پڑا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا دونوں کے درمیان۔ پھر ایسا کوڑا لایا گیا جو سواری میں استعمال ہو چکا تھا / اس سے آپ ﷺ نے ضرب لگوائی۔ اسی مضمون سے ملتی جلتی روایت ابو عثمان النہدی نے حضرت عمرؓ کے متعلق بھی بیان کی ہے کہ وہ او سط درجے کا

کوڑا استعمال کرتے تھے۔ (احکام القرآن جصاص، ج 3۔ ص 322)۔ گرہ لگا ہوا کوڑا یادو شاخہ سے شاخہ کوڑا بھی استعمال کرنا ممنوع ہے۔

مار بھی اوسط درجے کی ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ مارنے والے کوہدایت کرتے تھے کہ لا ترفع (یا لاتخرج) ابٹک "اس طرح مار کہ تیری بغل نہ کھلے"۔ یعنی پوری طاقت سے ہاتھ کو تان کرنے مار (احکام القرآن ابن عربی۔ ج 2 ص 84۔ احکام القرآن جصاص، ج 3۔ ص 322)۔ تمام فقهاء اس پر متفق ہیں کہ ضرب مبرح نہیں ہونی چاہیے، یعنی زخم ڈال دینے والی۔ ایک ہی جگہ نہیں مارنا چاہی بلکہ تمام جسم پر مار کو پھیلا دینا چاہیے۔ صرف منه اور شرم گاہ کو (اور حنفیہ کے نزدیک سر کو بھی) بچالینا چاہیے، باقی ہر عضو پر کچھ نہ کچھ مار پڑنی چاہیے۔ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو کوڑے لگواتے وقت فرمایا "ہر عضو کو اس کا حق دے اور صرف منه اور شرم گاہ کو بچالے"۔ دوسری روایت میں ہے "صرف سر اور شرم گاہ کو بچالے" (احکام القرآن جصاص، ج 3۔ ص 321)۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے اذا ضرب احد کم فليتق لو جه جب تم میں سے کوئی مارے تو منه پر نہ مارے" (ابوداؤد)۔

مرد کو کھڑا کر کے مارنا چاہیے اور عورت کو بٹھا کر۔ امام ابو حنیفہؓ کے زمانے میں کوفہ کے قاضی ابن ابی لیلی نے ایک عورت کو کھڑا کر کے پٹوایا۔ اس پر امام ابو حنیفہ نے سخت گرفت کی اور علانیہ ان کے فیصلے کو غلط ٹھیک رکھا (اس سے قانون توہین عدالت کے معاملے میں بھی امام صاحب کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے)۔ ضرب تازیانہ کے وقت عورت اپنے پورے کپڑے پہنے رہے گی، بلکہ اس کے پکڑے اچھی طرح باندھ دیے جائیں گے تاکہ اس کا جسم کھل نہ جائے صرف موٹے کپڑے اتروادیے جائیں گے۔ مرد کے معاملے میں اختلاف ہے۔ بعض فقهاء کہتے ہیں وہ صرف پاجامہ پہنے رہے گا، اور بعض کہتے ہیں کہ تمیض بھی نہ اتروادیا جائے گا۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے ایک زانی کو سزاۓ تازیانہ کا حکم دیا اس نے کہا "اس گناہ گار جسم

کو اچھی طرح مار کھانی چاہیے“، اور یہ کہہ کر وہ قمیص اتارنے لگا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا“ اسے قمیص نہ اتارنے دو“۔ (احکام القرآن جصاص، ج 3۔ ص 322)۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک شخص کو کوڑے لگوانے گئے اور وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

سخت سردی اور سخت گرمی کے وقت مارنا ممنوع ہے۔ جاڑے میں گرم وقت اور گرمی میں ٹھنڈے وقت مارنے کا حکم ہے۔

باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں ہے، الایہ کہ مجرم بھاگنے کی کوشش کرے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرمانے ہیں **لَا يحل في لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** تحرید ولا مدد اس امت میں ننگا کر کے اور ٹکٹکی پر باندھ کر مارنا حلال نہیں ہے۔

فقہاء نے اس کو جائز رکھا ہے کہ روزانہ کم از کم بیس بیس کوڑے مارے جائیں۔ لیکن اولیٰ یہی ہے کہ بیک وقت پوری سزادے دی جائے۔

مار کا کام اجڑ جلادوں سے نہیں لینا چاہیے بلکہ صاحب علم و بصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہیے جو جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ ابن قیمؓ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، مقداد بن عمرو، محمدؓ بن مسلمہ، عاصمؓ بن ثابت اور ضحاکؓ بن سفیان جیسے صلحاء و معززین سے جلادی کی خدمت لی جاتی تھی (ج 1۔ ص 44-45)۔

اگر مجرم مریض ہو، اور اس کے صحت یا بہونے کی امید نہ ہو، یا بہت بوڑھا ہو تو سوشاخوں والی ایک ٹھنپی، یا سوتیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ کار دینا چاہیے تاکہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔ نبی ﷺ کے زمانے میں ایک بوڑھا مرض زنا کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور آپؐ نے اس کے لیے یہی سزا تجویز فرمائی تھی (احمد، ابو داؤد،نسائی،ابن ماجہ)۔ حاملہ عورت کو سزاۓ تازیانہ دینی ہو تو وضع حمل کے بعد نفاس

کا زمانہ گزر جانے تک انتظار کرنا ہوا۔ اور رجم کرنا ہو تو جب تک اس کے پچ کا دودھ نہ چھوٹ جائے، سزا نہیں دی جاسکتی۔

اگر زنا شہادتوں سے ثابت ہو تو گواہ ضرب کی ابتدا کریں گے، اور اگر اقرار کی بنابر سزادی جارہی ہو تو قاضی خود ابتدا کرے گا، تاکہ گواہ اپنی گواہی کو اور نجاح اپنے فیصلوں کو کھیل نہ سمجھ بیٹھیں۔ شراحت کے مقدمے میں جب حضرت علیؑ نے رجم کا فیصلہ کیا تو فرمایا ”اگر اس کے جرم کا کوئی گواہ ہو تو اسی کامار کی ابتدا کرنی چاہیے تھی، مگر اس کو اقرار کی بنابر سزادی جارہی ہے اس لیے میں خود ابتدا کروں گا۔“ حنفیہ کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔ شافعیہ اس کو واجب نہیں مانتے، مگر سب کے نزدیک اولیٰ بھی ہے۔

ضرب تازیانہ کے قانون کی ان تفصیلات کو دیکھیے اور پھر ان لوگوں کی جرأت کی داد دیجیے جو اسے تو وحشیانہ سزا کہتے ہیں، مگر وہ سزاۓ تازیانہ ان کے نزدیک بڑی مہذب سزا ہے جو آج جیلوں میں دی جارہی ہے۔ موجودہ قانون کی رو سے صرف عدالت ہی نہیں، جیل کا ایک معمولی سپرنٹنٹ بھی ایک قیدی کو حکم عدالتیاً گستاخی کے قصور میں 30 ضرب بید تک کی سزادینے کا مجاز ہے۔ یہ بید لگانے کے لیے ایک آدمی خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کی مشق کرتا رہتا ہے۔ اس غرض کے لیے بید بھی خاص طور پر بھگو بھگو کر تیار کیے جاتے ہیں تاکہ جسم کو چھری کی طرح کاٹ دیں۔ مجرم کو ننگا کر کے ٹکٹکی سے باندھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ تڑپ بھی نہ سکے۔ صرف ایک پلا ساکپڑا اس کے ستر کو چھپانے کے لیے رہنے دیا جاتا ہے اور وہ ٹنکچر آیوڈین سے بھگو دیا جاتا ہے۔ جلا دوسرے بھاگتا ہوا آتا ہے اور پوری طاقت سے مارتا ہے ضرب ایک، ہی مخصوص حصہ جسم (یعنی سرین) پر مسلسل لگائی جاتی ہے یہاں تک کہ گوشت قیمه ہو کر اڑتا چلا جاتا ہے اور بسا اوقات ہڈی نظر آنے لگتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طاقت ور سے طاقت ور آدمی بھی پورے تیس بید کھانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کے زخم بھرنے میں ایک مدت لگ جاتی ہے۔ اس

”مہذب“ سزا کو جو لوگ آج جیلوں میں خود نافذ کر رہے ہیں ان کا یہ منہ ہے کہ اسلام کی مقرر کی ہوئی سزا نے تازیانہ کو ”وحشیانہ“ سزا کے نام سے یاد فرمائیں، پھر ان کی پولیس ثابت شدہ مجرموں کو نہیں بلکہ محض مشتبہ لوگوں کو تفتیش کی خاطر (خصوصاً سیاسی جرائم کے شبہات میں) جیسے جیسے عذاب دیتی ہے وہ آج کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

(۲۳): رجم کی سزا میں جب مجرم مر جائے تو پھر اس سے پوری طرح مسلمانوں کا سامعاملہ کا جائے گا۔ اس کی تجویز و تنفیں کی جائے گی۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس کو عزت کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اس کے حق میں دعائے مغفرت کی جائے گی اور کسی کے لیے جائزہ ہو گا کہ اس کا ذکر برائی کے ساتھ کرے۔ بخاری میں جابر بن عبد اللہ الانصاری کی روایت ہے کہ جب رجم سے ماعز بن مالک کی موت واقع ہو گئی تو نبی ﷺ نے اس کو خیر سے یاد فرمایا اور اس کی نماز جنازہ خود پڑھائی۔

مسلم میں حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا استغفروالماعزین مالک، لقد تاب توبة لوقسیت بین امة لوسعتهم، ماعز بن مالک کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک پوری امت پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔ اسی روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ غامدیہ جب رجم سے مر گئی تو حضور ﷺ نے خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی، اور جب حضرت خالد بن ولید نے اس کا ذکر برائی سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا مهلا یا خالد، فوالزی نفسی بیدہ لقد تابت توبۃ لوتا بہا صاحب مکس الغفرلہ خالد اپنی زبان روکو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ظالمانہ محسول وصول کرنے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ماعز کے واقعہ کے بعد ایک روز حضور ﷺ راستے سے گزر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے دو شخصوں کو ماعز کا ذکر برائی سے کرتے سن۔ چند قدم آگے جا کر ایک گدھے کی لاش پڑی نظر آئی۔

حضور ﷺ نے اور ان دونوں آدمیوں سے کہا ”آپ حضرات اس میں سے کچھ نوش جان فرمائیں۔“

انہوں نے عرض کیا ”یا نبی اللہ! اسے کون کھا سکتا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”اپنے بھائی کی آبرو سے جو کچھ آپ ابھی تناول فرمار ہے تھے وہ اسے کھانے کی بہ نسبت بدر تر چیز تھی۔“ مسلم میں عمران بن حصین کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے غامدیہ کی نماز جنازہ کے موقع پر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ، کیا اب اس زانیہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟ آپ نے فرمایا **لقد تابت توبۃ لوقست بین اهل البیت لوسعتم**، اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر تمام اہل مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص کو شراب نوشی کے جرم میں سزا دی جا رہی تھی۔ کسی کی زبان سے نکلا ”خدا تجھے رسوا کرے۔“ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا ”اس طرح نہ کہو، اس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو۔“

ابوداؤد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے حضور ﷺ نے فرمایا ”بلکہ یوں کہ اللہمَ اغفرْ لِهِ، اللہمَ ارْحَمْهِ، خدا یا اسے معاف کر دے، خدا یا اس پر رحم کر۔“ یہ ہے اسلام میں سزا کی اصل روح۔ اسلام کسی بڑے سے بڑے مجرم کو بھی دشمنی کے جذبے سے سزا نہیں دیتا بلکہ خیر خواہی کے جذبے سے دیتا ہے، اور جب سزا دے چلتا ہے تو پھر اسے رحمت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کم ظرفی صرف موجودہ تہذیب نے پیدا کی ہے کہ حکومت کی فوج یا پولیس جسے مار دے، اور کوئی عدالتی تحقیقات جس کے مارنے کو جائز ٹھیکارا دے، اس کے متعلق یہ تک گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی اس کا جنازہ اٹھائے یا کسی کی زبان سے اس کا ذکر خیر سنا جائے۔ اس پورا اخلاقی جرأت (یہ موجودہ تہذیب میں ڈھٹائی کا مہندب نام ہے) کا یہ عالم ہے کہ دنیا کو رواداری کے وعظ سنائے جاتے ہیں۔

(۲۵): محramات سے زنا کے متعلق شریعت کا قانون تفہیم القرآن جلد اول صفحہ 336 پر، اور عمل قوم لوٹ کے متعلق شرعی فیصلہ تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ 51-54 پر بیان کیا جا چکا ہے۔ رہا جانور سے فعل بد، تو

بعض فقهاء اس کو بھی زنا کے حکم میں شمار کرتے ہیں اور اس کے مرتكب کو حد زنا کا مستحق ٹھیکارتے ہیں، مگر امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام زفر، امام مالک اور امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ زنا نہیں ہے اس لیے اس کا مرتكب تعزیر کا مستحق ہے کہ حد زنا کا۔ تعزیر کے متعلق ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اس کا فیصلہ قاضی کی رائے پر چھوڑا گیا ہے، یا مملکت کی مجلد شوریٰ ضرورت سمجھے تو اس کے لیے کوئی مناسب شکل خود تجویز کر سکتی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 3 ▲

اویں چیز جو اس آیت میں قابل توجہ ہے وہ یہ کہ یہاں فوجداری قانون کو ”**دین اللہ**“ فرمایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف نماز اور روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی دین نہیں ہیں، مملکت کا قانون بھی دین ہے۔ دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کا قانون اور نظام شریعت قائم کرنا بھی ہے۔ جہاں یہ چیز قائم نہ ہو وہاں نماز اگر قائم ہو بھی تو گویا دھورا دین قائم ہوا۔ جہاں اس کو رد کر کے دوسرا کوئی قانون اختیار کیا جائے وہاں کچھ اور نہیں خود دین اللہ رد کر دیا گیا۔

دوسری چیز جو اس میں قابل توجہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی یہ تنی ہے کہ زانی اور زانیہ پر میری تجویز کردہ سزا نافذ کرنے میں مجرم کے لیے رحم اور شفقت کا جذبہ تمہارا ہاتھ نہ پکڑے۔ اس بات کو اور زیادہ کھول کر نبی ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا یعنی **بواں نقص من الحد سو طافی قال له لِمْ فعلت ذلک؟ فیقول رحمة لعبادك - فیقال له انت ارحم بهم منی؟ فیومربه الی النار - ویعتری بن زاد سو طافی قال له لم فعلت ذاك؟ فیقول لینته واعن معاصیک - فیقول انت احکم بهم منی؟ فیومربه الی النار -** ”قیامت کے روز ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حد میں سے ایک کوڑا کم کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا یہ حرکت تو نے کیوں کی تھی؟ وہ عرض کرے گا آپ کے بندوں پر رحم کھا کر۔ ارشاد ہو گا اچھا، تو ان کے حق میں مجھ سے زیادہ

رجیم تھا! پھر حکم ہو گا لے جاؤ اسے دوزخ میں۔ ایک اور حاکم لا یا جائے گا جس نے حد پر ایک کوڑے کا اضافہ کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا تو نے یہ کیا کیا تھا؟ وہ عرض کرے گا تاکہ لوگ آپ کی نافرمانیوں سے باز رہیں۔ ارشاد ہو گا اچھا، تو ان کے معاملے میں مجھ سے زیادہ حکیم تھا! پھر حکم ہو گا لے جاؤ اسے دوزخ میں” (تفسیر کبیر۔ ج 6۔ ص 225) یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ کمی بیشی کا عمل رحم یا مصلحت کی بنا پر ہو۔ لیکن اگر کہیں احکام میں رو بدل مجرموں کے مرتبے کی بنا پر ہونے لگے تو پھر یہ ایک بدترین جرم ہے۔ صحیحین میں سے حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے خبطہ میں فرمایا ”لوگو، تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ ہلاک ہو گئیں اس لیے کہ جب ان میں کوئی عزت والا چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے“ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ”ایک حد جاری کرنا اہل زمین کے لیے چالیس دن کی بارش سے زیادہ مفید ہے“ (نسائی و ابن ماجہ)۔ بعض مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مجرم کو جرم ثابت ہونے کے بعد چھوڑنہ دیا جائے اور نہ سزا میں کمی کی جائے، بلکہ پورے سو کوڑے مارے جائیں۔ اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہلکی مارنے ماری جائے جس کی کوئی تکلیف ہی مجرم محسوس نہ کرے۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ دونوں ہی مراد معلوم ہوتے ہیں۔ اور مزید براں یہ مراد بھی ہے کہ زانی کو وہی سزادی جائے جو اللہ نے تجویز فرمائی ہے، اسے کسی اور سزا سے نہ بدل دیا جائے۔ کوڑوں کے بجائے کوئی اور سزادینا اگر رحم اور شفقت کی بنا پر ہو تو معصیت ہے، اور اگر اس خیال کی بنا پر ہو کہ کوڑوں کی سزا یک وحشیانہ سزا ہے تو یہ قطعی کفر ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی ایمان کے ساتھ ایک سینے میں جمع نہیں ہو سکتا۔ خدا کو خدا بھی ماننا اور اس کو معاذ اللہ و حشی بھی کہنا صرف ان ہی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو ذلیل ترین قسم کے منافق ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 4 ▲

یعنی سزا علی الاعلان عام لوگوں کے سامنے دی جائے، تاکہ ایک طرف مجرم کو فضیحت ہو اور دوسری طرف عوام الناس کو نصیحت۔ اس سے اسلام کے نظریہ سزا پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ سورہ مائدہ میں چوری کی سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا جَزَاءٌ بِمَا كَسَبَ إِنَّمَا كَسَبَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۚ ان کے کیے کا بدلا اور اللہ کی طرف سے جرم کو روکنے والی سزا“ (آیت 38) اور اب یہاں ہدایت کی جا رہی ہے کہ زانی کو علانیہ لوگوں کے سامنے عذاب دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون میں سزا کے تین مقصد ہیں۔ اول یہ کہ مجرم سے اس زیادتی کا بدلہ لیا جائے اور اس کو اس برائی کا مرا چکھایا جائے جو اس نے کسی دوسرے شخص یا معاشرے کے ساتھ کی تھی۔ دوم یہ کہ اسے اعادہ جرم سے باز رکھا جائے۔ سوم یہ کہ اس کی سزا کو ایک عبرت بنادیا جائے تاکہ معاشرے میں جو دوسرے لوگ برے میلانات رکھنے والے ہوں ان کے دماغ کا آپریشن ہو جائے اور وہ اس طرح کے کسی جرم کی جرأت نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ علانیہ سزادیہ کی ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں حکام سزادیہ میں بے جار عایت یا بے جا سختی کرنے کی کم ہی جرأت کر سکتے ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 5 ▲

یعنی زانی غیر تائب کے لیے اگر موزوں ہے تو زانیہ ہی موزوں ہے، یا پھر مشرک۔ کسی مومنہ صالحہ کے لیے وہ موزوں نہیں ہے، اور حرام ہے اہل ایمان کے لیے کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی لڑکیاں ایسے فاجروں کو دیں۔ اسی طرح زانیہ (غیر تائبہ) عورتوں کے لیے اگر موزوں ہیں تو ان ہی جیسے زانی یا پھر مشرک۔ کسی مومن صالحہ کے لیے وہ موزوں نہیں ہیں، اور حرام ہے مومنوں کے لیے کہ جن عورتوں کی بد چلنی کا حال انہیں معلوم ہوان سے وہ دانستہ نکاح کریں۔ اس حکم کا اطلاق صرف ان ہی مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو اپنی بری روشن پر قائم ہوں۔ جو لوگ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں ان پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ توبہ و اصلاح کے بعد "زانی" ہونے کی صفت ان کے ساتھ لگی نہیں رہتی۔

زنی کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا مطلب امام احمد بن حنبلؓ نے یہ لیا ہے کہ سرے سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد محض ممانعت ہے، نہ یہ کہ اس حکم ممانعت کے خلاف اگر کوئی نکاح کرے تو وہ قانوناً نکاح ہی نہ ہو اور اس نکاح کے باوجود فریقین زانی شمار کیے جائیں۔ نبی ﷺ نے یہ بات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر ارشاد فرمائی ہے کہ الحرام لا یحرم الحال حرام حلال کو حرام نہیں کر دیتا " (طبرانی، دارقطنی) یعنی ایک غیر قانونی فعل کسی دوسرے قانونی فعل کو غیر قانونی نہیں بنادیتا الہا کسی شخص کا ارتکاب زنا اس بات کا موجب نہیں ہو سکتا کہ وہ نکاح بھی کرے تو اس کا شمار زنا ہی میں ہو اور معاہدہ نکاح کا دوسرا فریق جو بد کار نہیں ہے، وہ بھی بد کار قرار پائے۔ اصولاً بغاوت کے سوا کوئی غیر قانونی فعل اپنے مرتكب کو خارج از حدود قانون (Out law) نہیں بنادیتا ہے کہ پھر اس کا کوئی فعل بھی قانونی نہ ہو سکے۔ اس چیز کو نگاہ میں رکھ کر اگر آیت پر غور کیا جائے تو اصل منشاصاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی بد کاری جانی بوجھی ہوان کو نکاح کے لیے منتخب کرنا ایک گناہ ہے جس سے اہل ایمان کو پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے بد کاروں کی ہمت افزائی ہوتی ہے، حالانکہ شریعت انہیں معاشرے کا ایک مکروہ اور قابل نفرت عنصر قرار دینا چاہتی ہے۔

اسی طرح اس آیت سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ زانی مسلم کا نکاح مشرک عورت سے، اور زانیہ مسلمہ کا نکاح مشرک مرد سے صحیح ہے۔ آیت کا منشار اصل یہ بتانا ہے کہ زنا ایسا سخت فتح فعل ہے کہ جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے اس کا ارتکاب کرے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ مسلم معاشرے کے پاک اور صالح لوگوں سے اس کا رشتہ ہو۔ اسے یا تو اپنے ہی جیسے زانیوں میں جانا چاہیے، یا پھر ان مشرکوں میں جو سرے سے احکام الہی پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔

آیت کے منشائی کی صحیح ترجمانی وہ احادیث کرتی ہیں جو اس سلسلے میں نبی ﷺ سے مردی ہیں۔ مسنند احمد اور نسائی میں عبد اللہ بن عمرو بْن عاص کی روایت ہے کہ ایک عورت اُم مہزول نامی تھی جو قبیه گری کا پیشہ کرتی تھی۔ ایک مسلمان نے اس سے نکاح کرنا چاہا اور نبی ﷺ سے اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے منع فرمایا اور یہی آیت پڑھی۔ ترمذی اور ابو داؤد میں ہے کہ مرثد بن ابی مرثد ایک صحابی تھے جن کے زمانہ جاہلیت میں کے کی ایک بد کار عورت عناق سے ناجائز تعلقات رہ چکے تھے۔ بعد میں انہوں نے چاہا کہ اس سے نکاح کر لیں اور حضور ﷺ سے اجازت مانگی۔ دو دفعہ پوچھنے پر آپ خاموش رہے۔ تیسرا دفعہ پھر پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا یا مرشد، الزان لاینكح الا زانية او مشركۃ فلاتنکھا اس کے علاوہ متعدد روایات حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عمار بن یاسر سے منقول ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص دیوٹ ہو (یعنی جس سے معلوم ہو کہ اس کی بیوی بد کار ہے اور یہ جان کر بھی وہ اس کا شوہر بنار ہے) وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا"۔ (احمد، نسائی، ابو داؤد اور طیالسی)۔ شیخین، ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ جو غیر شادی شدہ مرد و عورت زنا کے الزام میں گرفتار ہوتے ان کو وہ پہلے سزاۓ تازیانہ دیتے تھے اور پھر انہی کا آپس میں نکاح کر دیتے تھے۔ ابن عمر کی روایت ہے کہ ایک روز ایک شخص بڑی پریشانی کی حالت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کچھ اس طرح بات کرنے لگا کہ اس کی زبان پوری طرح کھلتی نہ تھی۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے کہا کہ اسے الگ لے جا کر معاملہ پوچھو۔ حضرت عمر کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ ایک شخص اس کے ہاں مہمان کے طور پر آیا تھا، وہ اس کی لڑکی سے ملوث ہو گیا۔ حضرت عمر نے کہا قبحك الله، الاسترت على ابنتك تیر ابراہو، تو نے اپنی لڑکی کا پردہ ڈھانک نہ دیا؟ آخر کار لڑکے اور لڑکی پر مقدمہ قائم ہوا، دونوں پر حد جاری کی گئی اور پھر ان دونوں کا باہم نکاح کر

کے حضرت ابو بکر نے ایک سال کے لیے ان کو شہر بدر کر دیا۔ ایسے اور چند واقعات قاضی ابو بکر ابن العربي نے اپنی کتاب احکام القرآن میں نقل کیے ہیں (جلد 2۔ ص 86)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 6 ▲

اس حکم کا منشایہ ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی آشنا یوں اور ناجائز تعلقات کے چرچے قطعی طور پر بند کر دیے جائیں، کیونکہ اس سے بے شمار برائیاں پھیلتی ہیں، اور ان میں سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اس طرح غیر محسوس طریقے پر ایک عام زنا کارانہ ماحول بنتا چلا جاتا ہے۔ ایک شخص مزے لے کر کسی کے صحیح یا غلط گندے واقعات دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ دوسرے اس میں نمک مرچ لگا کر اور لوگوں تک انہیں پہنچاتے ہیں، اور ساتھ ساتھ کچھ مزید لوگوں کے متعلق بھی اپنی معلومات یا بدگمانیاں بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ شہوانی جذبات کی ایک عام رو چل پڑتی ہے، بلکہ برے میلانات رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرے میں کہاں کہاں ان کے لیے قسمت آزمائی کے موقع موجود ہیں۔ شریعت اس چیز کا سد باب پہلے ہی قدم پر کر دینا چاہتی ہے۔ ایک طرف وہ حکم دیتی ہے کہ اگر کوئی زنا کرے اور شہادتوں سے اس کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو وہ انتہائی سزا دو جو کسی اور جرم پر نہیں دی جاتی۔ اور دوسری طرف وہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے وہ یا تو شہادتوں سے اپنا الزام ثابت کرے، ورنہ اس پر اسی کوڑے بر سادو تاکہ آئندہ کبھی وہ اپنی زبان سے ایسی بات بلا ثبوت نکالنے کی جرأت نہ کرے۔ بالفرض اگر الزام لگانے والے نے کسی کو اپنی آنکھوں سے بھی بد کاری کرتے دیکھ لیا ہو تو بھی اسے خاموش رہنا چاہیے اور دوسروں تک اسے نہ پہنچانا چاہیے، تاکہ گندگی جہاں ہے وہیں پڑی رہے، آگے نہ پھیل سکے۔ البتہ اگر اس کے پاس گواہ موجود ہیں تو معاشرے میں بیہودہ چرچے کرنے کے بجائے معاملہ حکام کے پاس لے جائے اور عدالت میں ملزم کا جرم ثابت کر کے اسے سزا دلوادے۔

اس قانون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تفصیلات نگاہ میں رہیں۔ اس لیے ہم ذیل میں ان کو نمبر وار بیان کرتے ہیں:

(۱) آیت میں الفاظ **وَالَّذِينَ يَرْمُونَ** استعمال ہوئے ہیں جن کے معنی ہیں "وہ لوگ جو الزام لگائیں"۔ لیکن سیاق و سباق یہ بتاتا ہے کہ یہاں الزام سے مراد ہر قسم کا الزام نہیں، بلکہ مخصوص طور پر زنا کا الزام ہے۔ پہلے زنا کا حکم بیان ہوا ہے اور آگے لعائن کا حکم آرہا ہے، ان دونوں کے درمیان اس حکم کا آنا صاف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں "الزام" سے مراد کس نوعیت کا الزام ہے۔ پھر الفاظ **يَرْمُونَ الْمُحَصَّنِ** (الزام لگائیں پاک دامن عورتوں پر) سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مراد وہ الزام ہے جو پاک دامنی کے خلاف ہو۔ اس پر مزید یہ کہ الزام لگانے والوں سے اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو پورے قانون اسلامی میں صرف زنا کا نصاب شہادت ہے۔ ان قرائیں کی بنا پر تمام امت کے علماء کا اجماع ہے کہ اس آیت میں صرف الزام زنا کا حکم بیان ہوا ہے، جس کے لیے علماء نے "قذف" کی مستقل اصطلاح مقرر کر دی ہے تاکہ دوسری تہمت تراشیاں (مثلاً کسی کو چور، یا شرابی، یا سودخوار، یا کافر کہہ دینا) اس حکم کی زد میں نہ آئیں۔ "قذف" کے سواد و سری تہمتوں کی سزا قاضی خود تجویز کر سکتا ہے، یا مملکت کی مجلس شوریٰ حسب ضرورت ان کے لیے توہین اور ازالہ حیثیت عرفی کا کوئی عام قانون بناسکتی ہے۔

(۲) آیت میں اگرچہ الفاظ **يَرْمُونَ الْمُحَصَّنِ** (پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں) استعمال ہوئے ہیں، لیکن فقهاء اس بات پر متفق ہیں کہ حکم صرف عورتوں ہی پر الزام لگانے تک محدود نہیں ہے بلکہ پاک دامن مردوں پر بھی الزام لگانے کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح اگرچہ الزام لگانے والوں کے لیے **الَّذِينَ يَرْمُونَ** مذکور کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ صرف مردوں ہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی

اگر جرم قذف کی مرتكب ہوں تو وہ اسی حکم کی سزاوار ہوں گی۔ کیونکہ جرم کی شناخت میں قاذف یا مقدوف کے مرد یا عورت ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لہذا قانون کی شکل یہ ہو گی کہ جو مرد یا عورت بھی کسی پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگانے اس کا یہ حکم ہے۔ (واضح رہے کہ یہاں محسن اور محسنة سے مراد شادی شدہ مرد و عورت نہیں بلکہ پاک دامن مرد و عورت ہیں)۔

(۳) یہ حکم صرف اسی صورت میں نافذ ہو گا جبکہ الزام لگانے والے نے محسنین یا محسنات پر الزام لگایا ہو کسی غیر محسن پر الزام لگانے کی صورت میں اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ غیر محسن اگر بد کاری میں معروف ہو تو اس پر "الزام" لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ ایسا نہ ہو تو اس کے خلاف بلا ثبوت الزام لگانے والے کے لیے قاضی خود سزا تجویز کر سکتا ہے، یا ایسی صورتوں کے لیے مجلس شوریٰ حسب ضرورت قانون بناسکتی ہے۔

(۴) کسی فعل قذف کے مستلزم سزا ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ کسی نے کسی پر بد کاری کا بلا ثبوت الزام لگایا ہے، بلکہ اس کے لیے کچھ شرطیں قاذف (الزام لگانے والے) میں اور کچھ مقدوف (الزام کے ہدف بنائے جانے والے) میں، اور کچھ خود فعل قذف میں پائی جانی ضروری ہیں۔

قاذف میں جو شرطیں پائی جانی چاہیں وہ یہ ہیں: اول یہ کہ وہ بالغ ہو۔ بچہ اگر قذف کا مرتكب ہو تو اسے تعزیر دی جاسکتی ہے مگر اس پر حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ دوم یہ کہ وہ عاقل ہو۔ مجنون پر حد قذف جاری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حرام نشے کے سوا کسی دوسری نوعیت کے نشے کی حالت میں، مثلاً کلوروفارم کے زیر اثر الزام لگانے والے کو بھی مجرم نہیں ٹھہرا یا جا سکتا۔ سوم یہ کہ اس نے اپنے آزاد ارادے سے (فقہاء کی اصطلاح میں طائعاً) یہ حرکت کی ہو۔ کسی کے جبر سے قذف کا ارتکاب کرنے والا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چہارم یہ کہ وہ مقدوف کا اپنا باپ یا دادا نہ ہو، کیونکہ ان پر حد قذف جاری نہیں کی جاسکتی۔ ان کے

علاوہ حنفیہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ ناطق ہو، گونگا اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ حد قذف کا مستوجب نہ ہو گا۔ لیکن امام شافعیؓ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر گونگے کا اشارہ بالکل صاف اور صریح ہو جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تو وہ قاذف ہے، کیونکہ اس کا اشارہ ایک شخص کو بدنام و رسوایہ کر دینے میں تصریح بالقول سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کے برعکس حنفیہ کے نزدیک محض اشارے کی صراحت اتنی قوی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ایک آدمی کو 80 کوڑوں کی سزادے ڈالی جائے۔ وہ اس پر صرف تعزیر دیتے ہیں۔

مقدوف میں جو شرطیں پائی جانی چاہیئیں وہ یہ ہیں: پہلی شرط یہ کہ وہ عاقل ہو، یعنی اس پر بحالت عقل زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ مجنون پر (خواہ وہ بعد میں عاقل ہو گیا ہو یا نہ ہوا ہو) الزام لگانے والا حد قذف کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ مجنون اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، اور اس پر اگر زنا کی شہادت قائم بھی ہو جائے تو نہ وہ حد زنا کا مستحق ہوتا ہے نہ اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ لہذا اس پر الزام لگانے والا بھی حد قذف کا مستحق نہ ہونا چاہیے۔ لیکن امام مالکؓ اور امام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ مجنون کا قاذف حد کا مستحق ہے کیونکہ بہر حال وہ ایک بے ثبوت الزام لگا رہا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو۔ یعنی اس پر بحالت بلوغ زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہو بچ پر الزام لگانا، یا جواب پر اس امر کا الزام لگانا کہ وہ بچپن میں اس فعل کا مرتكب ہوا تھا، حد قذف کا موجب نہیں ہے، کیونکہ مجنون کی طرح بچہ بھی اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، نہ وہ حد زنا کا مستوجب ہوتا ہے، اور نہ اس کی عزت مجروح ہوتی ہے۔ لیکن امام مالکؓ کہتے ہیں کہ سن بلوغ کے قریب عمر کے لڑکے پر اگر زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تب تو قاذف حد کا مستحق نہیں ہے، لیکن اگر ایسی عمر کی لڑکی پر زنا کرنے کا الزام لگایا جائے جس کے ساتھ مباشرت ممکن ہو، تو اس کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے خاندان تک کی عزت مجروح ہو۔

جاتی ہے اور لڑکی کا مستقبل خراب ہو جاتا ہے۔ تیسرا شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، یعنی اس پر بحالت اسلام زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو، کافر پر الزام، یا مسلم پر یہ الزام کہ وہ بحالت کفر اس کا مر تکب ہوا تھا، موجب حد نہیں ہے، کیونکہ غلام کی بے بسی اور کمزوری یہ امکان پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی عصمت کا اہتمام نہ کر سکے۔ خود قرآن میں بھی غلامی کی حالت کو احسان کی حالت قرار نہیں دیا گیا ہے، چنانچہ سورہ نساء میں مُحْسَنَات کا الفاظ لونڈی کے بال مقابل استعمال ہوا ہے۔ لیکن داؤد ظاہری اس دلیل کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ لونڈی اور غلام کا قاذف بھی حد کا مستحق ہے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ عفیف ہو، یعنی اس کا دامن زنا اور شبہ زنا سے پاک ہو۔ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر پہلے کبھی جرم زنا ثابت نہ ہو چکا ہو۔ شبہ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاح فاسد، یا خفیہ نکاح، یا مشتبہ ملکیت، یا شبہ نکاح میں مباشرت نہ کر چکا ہو، نہ اس کے حالات زندگی ایسے ہوں جن میں اس پر بد چلنی اور آبرو باخنگی کا الزام چسپاں ہو سکتا ہو، اور نہ زنا سے کم تر درجہ کی بد اخلاقیوں کا الزام اس پر پہلے کبھی ثابت ہو چکا ہو، کیونکہ ان سب صورتوں میں اس کی عفت مجرموں ہو جاتی ہے، اور ایسی مجرموں عفت پر الزام لگانے والا 80 کوڑوں کی سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اگر حد قذف جاری ہونے سے پہلے مقدزوں کے خلاف کسی جرم زنا کی شہادت قائم ہو جائے، تب بھی قاذف چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ وہ شخص پاک دامن نہ رہا جس پر اس نے الزام لگایا تھا۔

مگر ان پانچوں صورتوں میں حد نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مجنون، یا بچے، یا کافر، یا غلام، یا غیر عفیف آدمی پر بلا ثبوت الزام زنا لگا دینے والا مستحق تعزیر بھی نہیں ہے۔

اب وہ شرطیں لیجیے جو خود فعل قذف میں پائی جانی چاہیں۔ ایک الزام کو دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز قذف بن سکتی ہے۔ یا تو قاذف نے مقدزوں پر ایسی وطی کا الزام لگایا ہو جو اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو مقدزوں پر حد واجب ہو جائے۔ یا پھر اس نے مقدزوں کوولد الزنا قرار دیا ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں

الزام صاف اور صریح ہونا چاہیے۔ کنایات کا اعتبار نہیں ہے جن سے زنا یا طعن فی النسب مراد ہونے کا انحصار قاذف کی نیت پر ہے۔ مثلاً کسی کو فاسق فاجر، بد کار، بد چلن وغیرہ الفاظ سے یاد کرنا۔ یا کسی عورت کو رنڈی، کسین، یا چھنال کہنا، یا کسی سید کو بٹھان کہہ دینا کنایہ ہے جس سے صریح قذف لازم نہیں آتا۔ اس طرح جو لفظ گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً حرامی یا حرام زادا وغیرہ ان کو بھی صریح قذف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ تعریض کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ بھی قذف ہے یا نہیں۔ مثلاً کہنے والا کسی کو مخاطب کر کے یوں کہے کہ "ہاں، مگر میں تو زانی نہیں ہوں"، یا "میری ماں نے تو زنا کرا کے مجھے نہیں جتنا ہے" امام مالک[ؓ] کہتے ہیں کہ اس طرح کی تعریض جس سے صاف سمجھ میں آجائے کہ قاتل کی مراد مخاطب کو زانی یا ولد الزنا قرار دینا ہے، قذف ہے جس پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، اور امام شافعی، سفیان ثوری، ابن شبرمہ، اور حسن بن صالح اس بات کے قائل ہیں کہ تعریض میں بہر حال شک کی گنجائش ہے، اور شک کے ساتھ حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ امام احمد اور اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ تعریض اگر لڑائی جھگڑے میں ہو تو قذف ہے اور ہنسی مذاق میں ہو تو قذف نہیں ہے۔ خلفاء میں سے حضرت عمر اور حضرت علی نے تعریض پر حد جاری کی ہے۔ حضرت عمر کے زمانے میں دو آدمیوں کے درمیان گالم گلوچ ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا "نہ میرا باپ زانی تھا نہ میری ماں زانی تھی"۔ معاملہ حضرت عمر کے پاس آیا۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا آپ لوگ اس سے کیا سمجھتے ہیں؟ کچھ لوگوں نے کہا اس نے اپنے باپ اور ماں کی تعریف کی ہے، اس کے ماں باپ پر تو حملہ نہیں کیا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے کہا اس کے لیے اپنے ماں باپ کی تعریف کرنے کے لیے کیا یہی الفاظ رہ گئے تھے؟ ان خاص الفاظ کو اس موقع پر استعمال کرنے سے صاف مراد یہی ہے کہ اس کے ماں باپ زانی تھے۔ حضرت عمر نے دوسرے گروہ سے اتفاق کیا اور حد جاری کر دی (جصاص ج 3، ص 330)۔ اس امر میں بھی اختلاف

ہے کہ کسی پر عمل قوم لوط علیہ السلام کے ارتکاب کا الزام لگانا قذف ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ اس کو قذف نہیں مانتے۔ امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک[ؓ] اور امام شافعی[ؓ] سے قذف قرار دیتے ہیں اور حد کا حکم لگاتے ہیں۔

(۵) جرم قذف قبل دست اندازی سرکار (Cognizable Offense) ہے یا نہیں، اس میں فقهاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ یہ حق اللہ ہے اس لیے قاذف پر بہر حال حد جاری کی جائے گی خواہ مقدوف مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ اس معنی میں تحقق اللہ ضرور ہے کہ جب جرم ثابت ہو جائے تو حد جاری کرنا واجب ہے، لیکن اس پر مقدمہ چلانا مقدوف کے مطالبے پر موقوف ہے، اور اس لحاظ سے یہ حق آدمی ہے۔ یہی رائے امام شافعی[ؓ] اور امام اوزاعی کی بھی ہے۔ امام مالک[ؓ] کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔ اگر حاکم کے سامنے قذف کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم قابل دست اندازی سرکار ہے، ورنہ اس پر کارروائی کرنا مقدوف کے مطالبے پر منحصر ہے۔

(۶) جرم قذف قبل راضی نامہ (Compoundable Offence) نہیں ہے۔ مقدوف عدالت میں دعویٰ لے کر نہ آئے تو یہ دوسری بات ہے لیکن عدالت میں معاملہ آجائے کے بعد قاذف کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنا الزام ثابت کرے، اور ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس پر حد جاری کی جائے گی۔ نہ عدالت اس کو معاف کر سکتی ہے اور نہ خود مقدوف، نہ کسی مالی تاوان پر معاملہ ختم ہو سکتا ہے، نہ توبہ کر کے یا معافی مانگ کر وہ سزا سے بچ سکتا ہے۔ نبی ﷺ کا یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے کہ **تعافوا الحدود فيها بینكم فيما بلغنى من حدٍ فقد وجب**، حدود کو آپس ہی میں معاف کر دو، مگر جس حد کا معاملہ میرے پاس پہنچ گیا وہ پھر واجب ہو گئی۔

(۷) حفیہ کے نزدیک حد قذف کا مطالبہ یا تو خود مقدوف کر سکتا ہے، یا پھر وہ جس کے نسب پر اس سے حرف آتا ہو اور مطالبہ کرنے کے لیے خود مقدوف موجود نہ ہو، مثلاً باپ، ماں، اولاد اور اولاد کی اولاد۔ مگر امام مالک[ؒ] اور امام شافعی[ؒ] کے نزدیک یہ حق قبل توریث ہے۔ مقدوف مر جائے تو اس کا ہر شرعی وارث حد کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ امام شافعی[ؒ] بیوی اور شوہر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ ہے کہ موت کے ساتھ رشتہ زوجیت ختم ہو جاتا ہے اور بیوی یا شوہر میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حالانکہ یہ دونوں ہی دلیلیں کمزور ہیں۔ مطالبہ حد کو قبل توریث ماننے کے بعد یہ کہنا کہ یہ حق بیوی اور شوہر کو اس لیے نہیں پہنچتا کہ موت کے ساتھ رشتہ زوجیت ختم ہو جاتا ہے خود قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن نے ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کو اس کا وارث قرار دیا ہے۔ رہی یہ بات کہ زوجین میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا، تو یہ شوہر کے معاملہ میں چاہے صحیح ہو مگر بیوی کے معاملے میں تو قطعاً غلط ہے۔ جس کی بیوی پر الزام رکھا جائے اس کی تو پوری اولاد کا نسب مشتبہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ حد قذف صرف نسب پر حرف آنے کی وجہ سے واجب قرار دی گئی ہے۔ نسب کے ساتھ عزت پر حرف آنا بھی اسکی ایک اہم وجہ ہے، اور ایک شریف مرد یا عورت کے لیے یہ کچھ کم بے عزتی نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا اس کے شوہر کو بد کار قرار دیا جائے۔ لہذا اگر حد قذف کا مطالبہ قبل توریث ہو تو زوجین کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔

(۸) یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کہ ایک شخص نے قذف کا ارتکاب کیا ہے، جو چیز اسے حد سے بچا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ چار گواہ ایسے لائے جو عدالت میں یہ شہادت دیں کہ انہوں نے مقدوف کو فلاں مرد یا عورت کے ساتھ بالفعل زنا کرتے دیکھا ہے۔ حفیہ کے نزدیک یہ چاروں گواہ بیک وقت عدالت میں

آنے چاہیں اور انہیں بیک وقت شہادت دینی چاہیے، کیونکہ اگر وہ یکے بعد دیگرے آئیں تو ان میں سے ہر ایک قاذف ہوتا چلا جائے گا اور اس کے لیے پھر چار گواہوں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہ ایک کمزور بات ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام شافعیؓ اور عثمان البٹیؓ نے کہی ہے کہ گواہوں کے بیک وقت آنے اور یکے بعد دیگرے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دوسرے مقدمات کی طرح گواہ ایک کے بعد ایک آئے اور شہادت دے۔ حنفیہ کے نزدیک ان گواہوں کا عادل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر قذف چار فاسق گواہ بھی لے آئے تو وہ حد قذف سے بچ جائے گا، اور ساتھ ہی مقدوف بھی حد زنا سے محفوظ رہے گا کیونکہ گواہ عادل نہیں ہیں۔ البتہ کافر، یا اندھے، یا غلام، یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ گواہ پیش کر کے قاذف سزا سے نہیں بچ سکتا۔ مگر امام شافعیؓ کہتے ہیں کہ قاذف اگر فاسق گواہ پیش کرے تو وہ اور اس کے گواہ سب حد کے مستحق ہوں گے۔ اور یہی رائے امام مالکؓ کی بھی ہے۔ اس معاملے میں حنفیہ کا مسلک ہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے۔ گواہ اگر عادل ہوں تو قاذف جرم قذف سے بری ہو جائے گا اور مقدوف پر جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ لیکن اگر گواہ عادل نہ ہوں تو قاذف کا قذف، اور مقدوف کا فعل زنا، اور گواہوں کا صدق و کذب، ساری ہی چیزیں مشکوک قرار پائیں گی اور شک کی بنا پر کسی کو بھی حد کا مستوجب قرار نہ دیا جاسکے گا۔

(۹) جو شخص ایسی شہادت پیش نہ کر سکے جو اسے جرم قذف سے بری کر سکتی ہو، اس کے لیے قرآن نے تین حکم ثابت کیے ہیں: ایک یہ کہ 80 کوڑے لگائے جائیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے۔ تیسرا یہ کہ وہ فاسق ہے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ﴿اَللّٰهُ اَلّٰذِيْنَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذُلِّكَ وَ اَصْلَحُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کریں کہ اللہ غفور اور رحیم ہے)۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فقرے میں توبہ اور اصلاح سے جس معافی کا

ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق ان تینوں احکام میں سے کس کے ساتھ ہے۔ فقهاء کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلے حکم سے اس کا تعلق نہیں، یعنی توبہ سے حد ساقط نہ ہو گی اور مجرم کو سزا نے تازیانہ بہر حال دی جائے گی۔ فقهاء اس پر بھی متفق ہیں کہ اس معافی تعلق آخری حکم سے ہے، یعنی توبہ اور اصلاح کے بعد مجرم فاسق نہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ (اس میں اختلاف صرف اس پہلو سے ہے کہ آیا مجرم نفس قذف سے فاسق ہوتا ہے یا عدالتی فیصلہ صادر ہونے کے بعد فاسق قرار پاتا ہے۔ امام شافعیؓ اور لیث بن سعد کے نزدیک وہ نفس قذف سے فاسق ہو جاتا ہے اس لیے وہ اسی وقت سے اس کو مردود الشہادت قرار دیتے ہیں۔ اس کے بر عکس امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام مالکؓ کہتے ہیں کہ وہ عدالتی فیصلہ نافذ ہو جانے کے بعد فاسق ہوتا ہے، اس لیے وہ نفاذ حکم سے پہلے تک اس کو مقبول الشہادت سمجھتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ مجرم کا عند اللہ فاسق ہونا نفس قذف کا نتیجہ ہے اور عند الناس فاسق ہونا اس پر موقوف ہے کہ عدالت میں اس کا جرم ثابت ہو اور وہ سزا پا جائے)۔ اب رہ جاتا ہے پچھا کا حکم، یعنی یہ کہ "قاذف کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے"۔ فقهاء کے درمیان اس پر بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے کہ آیا **اللّٰہُ الَّذِيْنَ تَابُوا** کے فقرے کا تعلق اس حکم سے بھی ہے یا نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس فقرے کا تعلق صرف آخری حکم سے ہے، یعنی جو شخص توبہ اور اصلاح کر لے گا وہ عند اللہ اور عند الناس فاسق نہ رہے گا، لیکن پہلے دونوں حکم اس کے باوجود برقرار رہیں گے، یعنی مجرم پر حد جاری کی جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادت بھی رہے گا۔ اس گروہ میں قاضی شریح، سعید بن مسّب، سعید بن جبیر، حسن بصریؓ، ابراہیم نخعی، ابن سیرین، مکحول، عبد الرحمن بن زید، ابو حنیفہ، ابو یوسف، زفر، محمد، سفیان ثوری اور حسن بن صالح رحمہم اللہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ **اللّٰہُ الَّذِيْنَ تَبُوا** کا تعلق پہلے حکم سے تو نہیں ہے مگر آخری دونوں حکموں سے ہے، یعنی توبہ کے بعد قذف کے سزا یافتہ مجرم کی شہادت بھی قبول کی جائے گی اور وہ فاسق بھی نہ شمار ہو گا۔

اس گروہ میں عطاء، طاؤس، مجاہد، شعیی، قاسم بن محمد، سالم، زہری، عکرمہ، عمر بن العزیز، ابن ابی نجح، سلیمان بن یسار، مسروق، ضحاک، مالک بن آنس، عثمان البشّی، لیث بن سعد، شافعی، احمد بن حنبل اور ابن جریر طبری رحمہم اللہ جیسے بزرگ شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنی تائید میں دوسرے دلائل کے ساتھ حضرت عمر کے اس فیصلے کو بھی پیش کرتے ہیں جو انہوں نے مغیرہ بن شعبہ کے مقدمے میں کیا تھا، کیونکہ اس کی بعض روایت میں یہ ذکر ہے کہ حد جاری کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ابو بکرؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں سے کہا اگر تم توبہ کرلو (یا "اپنے جھوٹ کا اقرار کرلو") تو میں آئندہ تمہاری شہادت قبول کروں گا ورنہ نہیں۔ دونوں ساتھیوں نے اقرار کر لیا، مگر ابو بکرؓ اپنے قول پر قائم رہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی قوی تائید معلوم ہوتی ہے، لیکن مغیرہ بن شعبہ کے مقدمے کی جور و داد ہم پہلے درج کر چکے ہیں اس پر گور کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس نظری سے اس مسئلے میں استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ وہاں نفس فعل متفق علیہ تھا اور خود مغیرہ بن شعبہ کو بھی اس سے انکار نہ تھا۔ بحث اس میں تھی کہ عورت کون تھی۔ مغیرہ بن شعبہ کہتے تھے کہ وہ ان کی اپنی بیوی تھیں جنہیں یہ لوگ ام جمیل سمجھ بیٹھے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ حضرت مغیرہؓ کی بیوی اور ام جمیل باہم اس حد تک مشابہ تھیں کہ واقعہ جتنی روشنی میں جتنے فاصلے سے دیکھا گیا اس میں یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ عورت ام جمیل ہے۔ مگر قرآن سارے کے سارے مغیرہ بن شعبہ کے حق میں تھے اور خود استغاثے کا بھی ایک گواہ اقرار کر چکا تھا کہ عورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ اسی بنابر حضرت عمرؓ نے مغیرہ بن شعبہ کے حق میں فیصلہ دیا اور ابو بکرؓ کو سزادینے کے بعد وہ بات کہی جو مذکورہ بالا روایتوں میں منقول ہوئی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا منشاء را اصل یہ تھا کہ تم لوگ مان لو کہ تم نے بے جا بدگمانی کی تھی اور آئندہ کے لیے ایسی بدگمانیوں کی بنا پر لوگوں کے خلاف الزامات عائد کرنے سے توبہ کرو، ورنہ آئندہ تمہاری شہادت کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ اس سے یہ

نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ جو شخص صریح جھوٹا ثابت ہو جائے وہ بھی حضرت عمرؓ کے نزدیک توبہ کر کے مقبول الشہادت ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں پہلے گروہ ہی کی رائے زیادہ وزنی ہے۔ آدمی کی توبہ کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہمارے سامنے جو شخص توبہ کرے گا ہم اسے اس حد تک تور عایت دے سکتے ہیں کہ اسے فاسق کے نام سے یاد نہ کریں، لیکن اس حد تک رعایت نہیں دے سکتے کہ جس کی زبان کا اعتبار ایک دفعہ جاتا رہا ہے اس پر پھر محض اس لیے اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ہمارے سامنے توبہ کر رہا ہے۔ علاوہ بریں خود قرآن کی عبادت کا انداز بیان بھی یہی بتا رہا ہے کہ **إِلَّا إِلَّذِينَ تَابُوا** کا تعلق صرف **أُولَئِكَ هُمُ الْفَسِقُونَ** سے ہے۔ اس لیے کہ عبارت میں پہلی وہ باتیں حکم کے الفاظ میں فرمائی گئی ہیں: ان کو اسی کوڑے مارو" ، "اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو"۔ اور تیسرا بات خبر کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے: "وہ خود ہی فاسق ہیں"۔ اس تیسرا بات کے بعد متصل ایہ فرمانا کہ "سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کر لیں ، خود ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ استثناء آخری فقرہ خبر یہ سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ پہلے دو محکمی فاقروں سے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ استثناء آخری فقرے تک محدود نہیں ہے، تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ شہادت قبول نہ کرو" کے فقرے تک پہنچ کر رک کیسے گیا، "اسی کوڑے مارو" کے فقرے تک بھی کیوں نہ پہنچ گیا۔

(۱۰) سوال کیا جاسکتا ہے کہ **إِلَّا إِلَّذِينَ تَابُوا** کا استثناء آخر پہلے حکم سے بھی متعلق کیوں نہ مان لیا جائے؟ قذف آخر ایک قسم کی توبہ ہی تو ہے۔ ایک آدمی اس کے بعد اپنا قصور مان لے، مقدوف سے معافی مانگ لے اور آئندہ کے لیے اس حرکت سے توبہ کر لے تو آخر کیوں نہ اسے چھوڑ دیا جائے جب کہ اللہ تعالیٰ خود حکم بیان کرنے کے بعد فرمرا ہے **إِلَّا إِلَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذِلْكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ**

رَحْمَةُ اللَّهِ - یہ تو ایک عجیب بات ہو گی کہ خدا معاف کر دے اور بندے معاف نہ کریں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ دراصل توبۃ کے تلفظ کا نام نہیں ہے بلکہ دل کے احساس ندامت اور عزم اصلاح اور رجوع الی الخیر کا نام ہے اور اس چیز کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے توبہ سے دنیوی سزا نہیں معاف نہیں ہوتی بلکہ صرف اخروی سزا معاف ہوتی ہے، اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو تم انہیں چھوڑ دو، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جو لوگ توبہ کر لیں گے میں ان کے حق میں غفور و رحیم ہوں۔ اگر توبہ سے دنیوی سزا نہیں بھی معاف ہونے لگیں تو آخر وہ کو نسا مجرم ہے جو سزا سے بچنے کے لیے توبہ نہ کرے گا؟

(۱۱) یہ بھی سوال کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنے الزام کے ثبوت میں شہادت نہ لاسکنا لازماً یہی معنی تو نہیں رکھتا کہ وہ جھوٹا ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا الزام واقعی صحیح ہو اور وہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے صرف ثبوت نہ دے سکنے کی بنابر فاسق ٹھہرایا جائے، اور وہ بھی عند الناس ہی نہیں عند اللہ بھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک شخص نے اگر اپنی آنکھوں سے بھی کسی کو بدکاری کرتے دیکھ لیا ہو پھر بھی وہ اس کا چرچا کرنے اور شہادت کے بغیر اس پر الزام عائد کرنے میں گنہگار ہے شریعت الہی یہ نہیں چاہتی ایک شخص اگر ایک گوشے میں نجاست لئے بیٹھا ہو تو دوسرا شخص اسے اٹھا کر سارے معاشرے میں پھیلانا شروع کر دے۔ اس نجاست کی موجودگی کا اگر اس کو علم ہے تو اس کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ یا اس کو جہاں وہ پڑی ہے وہیں پڑا رہنے دے، یا پھر اس کی موجودگی کا ثبوت دے تاکہ حکومت اسلامی کے حکام اسے صاف کر دیں۔ ان دور استوں کے سوا کوئی تیسرے راستہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اگر وہ پبلک میں چرچا کرے گا تو محدود گندگی کو وسیع پیانے پر پھیلانے کا مجرم ہو گا۔ اور اگر وہ قابل اطمینان شہادت کے بغیر حکام تک معاملہ لے جائے گا تو حکام اس گندگی کو صاف نہ کر سکیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہو گا

کہ اس مقدمے کی ناکامی گندگی کی اشاعت کا سبب بھی بنے گی اور بدکاروں میں جرأت بھی پیدا کر دے گی۔ اسی لیے ثبوت اور شہادت کے بغیر قذف کا ارتکاب کرنے والا بہر حال فاسق ہے خواہ وہ اپنی جگہ سچا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۲) حد قذف کے بارے میں فقهاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ قاذف کو زانی کی بہ نسبت ہلکی مارماری جائے۔ یعنی تازیانے تو ۸۰ ہی ہوں، مگر ضرب اتنی سخت نہ ہونی چاہیے جتنی زانی کو لگائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس الزام کے قصور میں اسے سزادی جاری ہے اس میں اس کا جھوٹا ہونا بہر حال یقینی نہیں ہے۔

(۱۳) تکرار قذف کے بارے میں حنفیہ اور جمہور فقهاء کا مسلک یہ ہے کہ قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران میں خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پر الزام لگایا ہو، اس پر ایک ہی حد جاری کی جائے گی۔ اور اگر اجرائے حد کے بعد وہ اپنے سابق الزام ہی کی تکرار کرتا رہے تو تجویز اسے لگائی جا چکی ہے وہی کافی ہو گی۔ البتہ اگر اجرائے حد کے بعد وہ اس شخص پر ایک نیا الزام زنا عائد کر دے تو پھر نئے سرے سے مقدمہ قائم کیا جائے گا۔ مغیرہ بن شعبہ کے مقدمہ میں سزا پانے کے بعد ابو بکرہ کھلے بندوں کہتے رہے کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ مغیرہ نے زنا کا ارتکاب کیا تھا"۔ حضرت عمر نے ارادہ کیا کہ ان پر پھر مقدمہ قائم کریں۔ مگر چونکہ وہ سابق الزام ہی کو دوہر ارہے تھے اس لیے حضرت علی نے رائے دی کہ اس پر دوسرا مقدمہ نہیں لایا جاسکتا، اور حضرت عمر نے ان کی رائے قبول کر لی۔ اس کے بعد فقهاء میں اس بات پر قریب قریب اتفاق ہو گیا کہ سزا یافتہ قاذف کو صرف نئے الزام ہی پر پکڑا جاسکتا ہے، سابق الزام کے اعادے پر نہیں۔

(۱۴) قذف جماعت کے معاملہ میں فقهاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص بہت سے لوگوں پر بھی الزام لگائے، خواہ ایک لفظ میں یا الگ الگ الفاظ میں، اس پر ایک ہی حد لگائی جائے گی الا یہ کہ حد لگنے کے بعد وہ پھر کسی نئے قذف کا ارتکاب کرے۔ اس لیے کہ آیت کے الفاظ یہ ہیں "جو لوگ

پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں" اس سے معلوم ہوا کہ ایک فرد ہی نہیں ایک جماعت پر الزام لگانے والا بھی صرف ایک ہی حد کا مستحق ہوتا ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ زنا کا کوئی الزام ایسا نہیں ہو سکتا جو کم از کم دو شخصوں پر نہ لگتا ہو۔ مگر اس کے باوجود شارع نے ایک ہی حد کا حکم دیا، عورت پر الزام کے لیے الگ اور مرد پر الزام کے لیے الگ حد کا حکم نہیں دیا۔ بخلاف اس کے امام شافعیؓ کہتے ہیں کہ ایک جماعت پر الزام لگانے والا خواہ ایک لفظ میں الزام لگائے یا الگ الگ الفاظ میں، اس پر ہر شخص کے لیے الگ الگ پوری حد لگائی جائے گی۔ یہ رائے عثمان البیٰ کی بھی ہے۔ اور ابن ابی لیلی کا قول، جس میں شعبی اور اوزاعی بھی ان کے ہم نواہیں یہ ہے کہ ایک لفظ میں پوری جماعت کو زانی کہنے والا ایک حد کا مستحق ہے اور الگ الگ الفاظ میں یہ ایک کو کہنے والا ہر ایک کے لیے الگ حد کا مستحق۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 7 ▲

یہ آیات پچھلی آیات کے کچھ مدت بعد نازل ہوئی ہیں۔ حد قذف کا حکم جب نازل ہوا تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ غیر مرد اور عورت کی بد چلنی دیکھ کر تو آدمی صبر کر سکتا ہے، گواہ موجود نہ ہوں تو زبان پر قفل چڑھالے اور معاملے کو نظر انداز کر دے۔ لیکن اگر وہ خود اپنی بیوی کی بد چلنی دیکھ لے تو کیا کرے؟ قتل کر دے تو الٹا سزا کا مستوجب ہو۔ گواہ ڈھونڈنے جائے تو ان کے آنے تک مجرم کب ٹھہرا رہے گا۔ صبر کرے تو آخر کیسے کرے۔ طلاق دے کر عورت کو رخصت کر سکتا ہے، مگر نہ اس عورت کو کسی قسم کی مادی یا اخلاقی سزا ملی نہ اس کے آشنا کو۔ اور اگر اسے ناجائز حمل ہو تو غیر کا بچہ الگ گلے پڑا۔ یہ سوال ابتداءً تو حضرت سعد بن عبادہ نے ایک فرضی سوال کی حیثیت میں پیش کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ میں اگر خدا نخواستہ اپنے گھر میں یہ معاملہ دیکھوں تو گواہوں کی تلاش میں نہیں جاؤں گا بلکہ تواریخ سے اسی وقت معاملہ طے کر دوں گا (بخاری و مسلم)۔ لیکن تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ بعض ایسے مقدمات عملًا پیش آگئے جن میں شوہروں نے اپنی آنکھوں سے یہ معاملہ دیکھا اور نبی ﷺ کے پاس اس کی شکایت لے گئے۔ عبد اللہ

بن مسعود اور ابن عمر کی روایات ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص (غالباً عوییر عجلانی) نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ، اگر ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے اور منہ سے بات نکالے تو آپ حد قذف جاری کر دیں گے، قتل کر دے تو آپ اسے قتل کر دیں گے، چپ رہے تو غیظ میں مبتلار ہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ اس پر حضور ﷺ نے دعا کی کہ خدا یا، اس مسئلے کا فیصلہ فرمایا (مسلم، بخاری، ابو داؤد، احمد، نسائی)۔ ابن عباسؓ کی روایات ہے کہ ہلال بن امیہ نے آکر اپنی بیوی کا معاملہ پیش کیا جسے انہوں نے پچشم خود ملوث دیکھا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا "ثبتت لاو، ورنہ تم پر حد قذف جاری ہو گی"۔ صحابہؓ میں اس پر عام پریشانی پھیل گئی، اور ہلال نے کہا اس خدا کی قسم جس نے آپ کو نبی بن کر بھیجا ہے، میں بالکل صحیح واقعہ عرض کر رہا ہوں جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملے میں ایسا حکم نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ بچا دے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (بخاری، احمد، ابو داؤد)۔ اس میں جو طریق تصفیہ تجویز کیا گیا ہے اسے اسلامی قانون کی اصطلاح میں "إعان" کہا جاتا ہے۔ یہ حکم آجائے کے بعد نبی ﷺ نے جن مقدمات کا فیصلہ فرمایا ان کی مفصل روادادیں کتب حدیث میں منقول ہیں اور وہی إعان کے مفصل قانون اور ضابطہ کا روای کام اخذ ہیں۔

ہلال بن امیہ کے مقدمے کی جو تفصیلات صحاح ستہ اور مسند احمد اور تفسیر ابن جریر میں ابن عباسؓ اور انس بن مالک سے منقول ہوئی ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد ہلال اور ان کی بیوی، دونوں عدالت نبوی میں حاضر کیے گئے۔ حضور ﷺ نے پہلے حکم خداوندی سنایا۔ پھر فرمایا "خوب سمجھو لو کہ آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے زیادہ سخت چیز ہے"۔ ہلال نے عرض کیا میں نے اس پر بالکل صحیح اذمام لگایا ہے۔ عورت نے کہا یہ بالکل جھوٹ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اچھا، تو ان دونوں میں ملاعنة کرائی جائے"۔ چنانچہ پہلے ہلال اٹھے اور انہوں نے حکم قرآنی کے مطابق قسمیں کھانی شروع کیں۔ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم اس دوران میں بار بار فرماتے رہے "اللہ کو معلوم ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟" پانچویں قسم سے پہلے حاضرین نے ہلال سے کہا "خداء ڈرو، دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلاکا ہے۔ یہ پانچویں قسم تم پر عذاب واجب کر دے گی"۔ مگر ہلال نے کہا جس خدا نے یہاں میری پیٹھ بچائی ہے وہ آخرت میں بھی مجھے عذاب نہیں دے گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے پانچویں قسم بھی کھا لی۔ پھر عورت اٹھی اور اس نے بھی قسمیں کھانی شروع کیں۔ پانچویں قسم سے پہلے اسے بھی روک کر کہا گیا کہ "خداء ڈرو، آخرت کے عذاب کی بہ نسبت دنیا کا عذاب برداشت کر لینا آسان ہے۔ یہ آخری قسم تجھ پر عذاب الہی کو واجب کر دے گی"۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر رکتی اور جھگٹتی رہی۔ لوگوں نے سمجھا اعتراض کرنا چاہتی ہے مگر پھر کہنے لگی "میں ہمیشہ کے لیے اپنے قبیلے کو رسوانیں کروں گی" اور پانچویں قسم بھی کھا گئی۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان تفریق کر ادی اور فیصلہ فرمایا کہ اس کا بچہ (جو اس وقت پیٹ میں تھا) ماں کی طرف منسوب ہو گا، باپ کا نہیں پکارا جائے گا، کسی کو اس پر یا اس کے بچے پر الزام لگانے کا حق نہ ہو گا، جو اس پر یا اس کے بچے پر الزام لگائے گاوہ حد قذف کا مستحق ہو گا، اور اس کو زمانہ عدت کے نفقے اور سکونت کا کوئی حق ہلال پر حاصل نہیں ہے کیونکہ یہ طلاق یا وفات کے بغیر شوہر سے جدا کی جا رہی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ اس کے ہاں جب بچہ ہو تو دیکھو، وہ کس پر گیا ہے۔ اگر اس اس شکل کا ہو تو ہلال کا ہے، اور اگر اس صورت کا ہو تو اس شخص کا ہے جس کے بارے میں اس پر الزام لگایا گیا ہے۔ وضع حمل کے بعد دیکھا گیا کہ وہ مؤخر الذکر صورت کا تھا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لولا الایمان (یا برداشت دیگر لولا مضی من کتاب اللہ) لکان لی ولها شان یعنی اگر قسمیں نہ ہوتیں (یا خدا کی کتاب پہلے ہی فیصلہ نہ کر چکی ہوتی) تو میں اس عورت سے بری طرح پیش آتا۔

عُویْمِر عَجَلَانِی کے مقدمے کی رواداد سہل بن سعد ساعدی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بخاری، مسلم، ابو داود، نسائی ابن ماجہ اور مسند احمد میں ملتی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ عُویْمِر اور ان کی بیوی، دونوں مسجد نبوی میں بلائے گئے۔ ملاعنت سے پہلے حضور ﷺ نے ان کو بھی تنبیہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا "اللہ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟" جب کسی نے توبہ نہ کی تو دونوں میں ملاعنت کرائی گئی۔ اس کے بعد عُویْمِر نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ اب اگر میں اس عورت کو رکھوں تو جھوٹا ہوں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے تین طلاقیں دے دیں بغیر اس کے کہ حضور ﷺ نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہوتا۔ سہل بن سعد کہتے ہیں کہ ان طلاقوں کو حضور ﷺ نے نافذ فرمادیا اور ان کے درمیان تفریق کرادی اور فرمایا کہ "یہ تفریق ہے ہر ایسے جوڑے کے معاملے میں جو باہم لعan کرے"۔ اور سنت یہ قائم ہو گئی کہ لعan کرنے والے زوجین کو جدا کر دیا جائے، پھر وہ دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ مگر ابن عمر صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کرادی۔ سہل بن سعد یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عورت حاملہ تھی اور عُویْمِر نے کہا کہ یہ حمل میراث نہیں ہے۔ اس بنا پر بچہ ماں کی طرف منسوب کیا گیا اور سنت یہ جاری ہوئی کہ اس طرح کا بچہ ماں سے میراث پائے گا اور ماں ہی اس سے میراث پائے گی۔

ان دو مقدموں کے علاوہ متعدد روایات ہم کو کتب حدیث میں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ کن اشخاص کے مقدموں کی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض ان ہی دونوں مقدموں سے تعلق رکھتی ہوں، مگر بعض میں کچھ دوسرے مقدمات کا بھی ذکر ہے اور ان سے قانون لعan کے بعض اہم نکات پر روشنی پڑتی ہے۔

ابن عمر ایک مقدمے کی رواداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زوجین جب لعan کرچکے تو نبی ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کر دی (بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ابن جریر)۔ ابن عمر کی ایک اور روایت ہے کہ ایک شخص اور اس کی بیوی کے درمیان لعan کرایا گیا۔ پھر اس نے حمل سے انکار کیا۔ نبی ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کر دی اور فیصلہ فرمایا کہ بچہ صرف ماں کا ہو گا (صحاح سنتہ اور احمد)۔ ابن عمر ہی کی ایک اور روایت ہے کہ ملاعنت کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا "تمہارا حساب اب اللہ کے ذمہ ہے، تم میں سے ایک بہر حال جھوٹا ہے"۔ پھر آپ ﷺ نے مرد سے فرمایا: لاسبیل لک علیہا (یعنی اب یہ تیری نہیں رہی۔ نہ تو اس پر کوئی حق جتا سکتا ہے، نہ کسی قسم کی دست درازی یا دوسرا منقسمانہ حرکت اس کے خلاف کرنے کا مجاز ہے)۔ مرد نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اور میر امال؟ (یعنی وہ مہر تو مجھے دلواییے جو میں نے اسے دیا تھا)۔ فرمایا: لا مال لک، ان کنت صدقۃ علیہا فهو بیا استحلت من فرجها و ان کنت کذبت علیہا فذاك بعد لک منها (یعنی مال واپس لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے، اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو وہ مال اس لذت کا بدل ہے جو تو نے حلال کر کے اس سے اٹھائی، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال تجھ سے اور بھی زیادہ دور چلا گیا، وہ اس کی بہ نسبت تجھ سے زیادہ دور ہے) بخاری، مسلم، ابو داؤد۔

دارقطنی نے علی بن ابی طالب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: "سنن یہ مقرر ہو چکی ہے کہ لعan کرنے والے زوجین پھر کبھی باہم جمع نہیں ہو سکتے" (یعنی ان کا دوبارہ نکاح پھر کبھی نہیں ہو سکتا)۔ اور دارقطنی ہی حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ یہ دونوں پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

قبیصہ بن ذؤبیب کی روایت ہے کہ حضرت عمر کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی بیوی کے حمل کو ناجائز قرار دیا، پھر اعتراض کر لیا کہ یہ حمل اس کا اپنا ہے، پھر وضع حمل کے بعد کہنے لگا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ معاملہ

حضرت عمر کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے اس پر حکم قذف جاری کی اور فیصلہ کیا کہ بچہ اسی کی طرف منسوب ہو گا (دارقطنی، بیہقی)۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا میری ایک بیوی ہے جو مجھے بہت محبوب ہے۔ مگر اس کا حال یہ ہے کہ کسی ہاتھ لگانے والے کا ہاتھ نہیں جھٹکتی (واضح رہے کہ یہ کنایہ تھا جس کے معنی زنا کے بھی ہو سکتے ہیں اور زنا سے کم تر درجے کی اخلاقی کمزوری کے بھی)۔ نبی ﷺ نے فرمایا طلاق دیدے۔ اس نے کہا مگر میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ فرمایا تو اسے رکھے رہ (یعنی آپ ﷺ نے اس سے اس کنایے کی تشریح نہیں کرائی اور اس کے قول کو الزام زنا پر محمول کر کے لعan کا حکم نہیں دیا)۔ نسائی۔

ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی نے حاضر ہو کر عرض کیا میری بیوی نے کالا لڑکا جنا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ میرا ہے (یعنی محض لڑکے کے رنگ نے اسے شبہ میں ڈالا تھا ورنہ بیوی پر زنا کا الزام لگانے کے لیے اس کے پاس کوئی اور وجہ نہ تھی)۔ آپ ﷺ نے پوچھا تیرے پاس کچھ اونٹ تو ہوں گے۔ اس نے عرض کیا ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا ان کے رنگ کیا ہیں؟ کہنے لگا سرخ۔ آپ ﷺ نے پوچھا ان میں کوئی خاکستری بھی ہے؟ کہنے لگا جی ہاں، بعض ایسے بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ رنگ کہاں سے آیا؟ کہنے لگا شاید کوئی رگ کھینچ لے گئی (یعنی ان کے باپ دادا میں سے کوئی اس رنگ کا ہو گا اور اسی کا اثر ان میں آگیا)۔ فرمایا "شاید اس بچے کو بھی کوئی رگ کھینچ لے گئی" اور آپ ﷺ نے اسے نفی وَلَد (بچے کے نسب سے انکار کی اجازت نہ دی (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد)۔

ابو ہریرہ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی ﷺ نے آیت لعan پر کلام کرتے ہوئے فرمایا "جو عورت کسی خاندان میں ایسا بچہ گھسالائے جو اس خاندان کا نہیں ہے (یعنی حرام کا پیٹ رکھوا کر شوہر کے سر منڈھ دے

(۱) اُس کا اللہ سے کچھ واسطہ نہیں، اللہ اس کو جنت میں ہرگز داخل نہ کرے گا۔ اور جو مرد اپنے بچے کے نسب سے انکار کرے حالانکہ بچہ اس کو دیکھ رہا ہو، اللہ قیامت کے روز اس سے پردہ کرے گا اور اسے تمام اگلی پچھلی خلق کے سامنے رسوائی کر دے گا (ابوداؤد، نسائی، دارمی)۔

آیتِ لعان اور یہ روایات و نظائر اور شریعت کے اصول عامہ اسلام میں قانونِ لعان کے وہ مأخذ ہیں جن کی روشنی میں فقہاء نے لعان کا مفصل ضابطہ بنایا ہے۔ اس ضابطے کی اہم دفعات یہ ہیں:

(۱) جو شخص بیوی کی بد کاری دیکھے اور لعان کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے قتل کا مر تکب ہو جائے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا کیونکہ اس کو خود حد جاری کرنے کا حق نہ تھا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے فعل پر کوئی مواخذہ ہو گا بشرطیکہ اس کی صداقت ثابت ہو جائے (یعنی یہ کہ فی الواقع اس نے زناہی کے ارتکاب پر یہ فعل کیا)۔ امام احمد اور اسحاق بن راہویہؓ کہتے ہیں کہ اسے اس امر کے دو گواہ لانے ہوں گے کہ قتل کا سبب یہی تھا۔ مالکیہ میں سے ابن القاسم اور ابن حبیب اس پر مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ زانی جسے قتل کیا گیا وہ شادی شدہ ہو، ورنہ کنوارے زانی کو قتل کرنے پر اس سے قصاص لیا جائے گا۔ مگر جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ اس کو قصاص سے صرف اس صورت میں معاف کیا جائے گا جبکہ وہ زنا کے چار گواہ پیش کرے، یا مقتول مرنے سے پہلے خود اس امر کا اعتراف کر چکا ہو کہ وہ اس کی بیوی سے زنا کر رہا تھا، اور مزید یہ کہ مقتول شادی شدہ ہو (نیل الاولار، ج 6، ص 228)۔

(۲) لعان گھر بیٹھے آپس ہی میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے۔

(۳) لعان کے مطالبے کا حق صرف مرد ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت بھی عدالت میں اس کا مطالبه کر سکتی ہے جبکہ شوہر اس پر بد کاری کا الزام لگائے یا اس کے بچے کا نسب تسلیم کرنے سے انکار کرے۔

(۲) کیا لعان ہر زوج اور زوجہ کے درمیان ہو سکتا ہے یا اس کے لیے دونوں میں کچھ شرائط ہیں؟ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؓ کہتے ہیں کہ جس کی قسم قانونی حیثیت سے معتبر ہو اور جس کو طلاق دینے کا اختیار ہو وہ لعان کر سکتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک صرف عاقل اور بالغ ہونا اہلیت لعan کے لیے کافی ہے خواہ زوجین مسلم ہوں یا کافر، غلام ہوں یا آزاد، مقبول الشہادت ہوں یا نہ ہوں، اور مسلم شوہر کی بیوی مسلمان ہو یا ذمی۔ قریب قریب یہی رائے امام مالکؓ اور امام احمدؓ کی بھی ہے۔ مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ لعان صرف ایسے آزاد مسلمان زوجین ہی میں ہو سکتا ہے جو قذف کے جرم میں سزا یافتہ نہ ہوں۔ اگر عورت اور مرد دونوں کافر ہوں، یا غلام ہوں، یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ ہوں تو ان کے درمیان لعan نہیں ہو سکتا۔ مزید برائے اگر عورت کبھی اس سے پہلے حرام یا مشتبہ طریقے پر کسی مرد سے ملوث ہو چکی ہو تو بھی لعan درست نہ ہو گا۔ یہ شرطیں حنفیہ نے اس بنابر لگائی ہیں کہ ان کے نزدیک لعan کے قانون اور قذف کے قانون میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ غیر آدمی اگر قذف کا مرتكب ہو تو اس کے لیے حد ہے اور شوہر اس کا ارتکاب کرے تو وہ لعan کر کے چھوٹ سکتا ہے۔ باقی تمام حیثیتوں سے لعan اور قذف ایک ہی چیز ہے۔ علاوہ بریں حنفیہ کے نزدیک چونکہ لعan کی قسمیں شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے وہ کسی ایسے شخص کو اس کی اجازت نہیں دیتے جو شہادت کا اہل نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں حنفیہ کا مسلک کمزور ہے اور صحیح بات وہی ہے جو امام شافعیؓ نے فرمائی ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے قذف زوجہ کے مسئلے کو آیت قذف کا ایک جز نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے لیے الگ قانون بیان کیا ہے، اس لیے اس کو قانون قذف کے ضمن میں لا کروہ تمام شرائط اس میں شامل نہیں کی جا سکتیں جو قذف کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ آیت لعan کے الفاظ آیت قذف کے الفاظ سے مختلف ہیں اور دونوں الگ الگ حکم ہیں، اس لیے لعan کا قانون آیت لعan ہی سے اخذ کرنا چاہیے نہ کہ آیت قذف سے۔ مثلاً آیت قذف

میں سزا کا مستحق وہ شخص ہے جو پاک دامن عورتوں (محضنات) پر الزام لگائے۔ لیکن آیتِ لعان میں پاک دامن بیوی کی شرط کہیں نہیں ہے۔ ایک عورت چاہے کبھی گناہ گار بھی رہی ہو، اگر بعد میں وہ توبہ کر کے کسی شخص سے نکاح کر لے اور پھر اس کا شوہر اس پر ناقص الزام لگائے تو آیتِ لعان یہ نہیں کہتی کہ اس عورت پر تہمت رکھنے کی یا اس کی اولاد کے نسب سے انکار کر دینے کی شوہر کو کھلی چھٹی دے دو کیونکہ اس کی زندگی کبھی داغ دار رہ چکی ہے۔ دوسری اور اتنی ہی اہم وجہ یہ ہے کہ قذف زوجہ اور قذف اجنبیہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ان دونوں کے بارے میں قانون کا مزاج ایک نہیں ہو سکتا۔ غیر عورت سے آدمی کا واسطہ نہیں۔ نہ جذبات کا نہ عزت کا نہ معاشرت کا نہ حقوق کا اور نہ نسل نسب کا اس کے چال چلن سے ایک آدمی کو کوئی بڑی سے بڑی باوقعت دلچسپی ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ معاشرے کو بد اخلاقی سے پاک دیکھنے کا جوش اسے لاحق ہو۔ اس کے بر عکس اپنی بیوی سے آدمی کا تعلق ایک طرح کا نہیں کئی طرح کا ہے اور بہت گھرا ہے۔ وہ اس کے نسب اور اس کے مال اور اس کے گھر کی امانت دار ہے۔ اس کی زندگی کی شریک ہے۔ اس کے رازوں کی امین ہے۔ اس کے نہایت گھرے اور نازک جذبات اس سے وابستہ ہیں۔ اس کی بد چلنی سے آدمی کی غیرت اور عزت پر، اس کے مفاد پر، اور اس کی آئندہ نسل پر سخت چوت لگتی ہے۔ یہ دونوں معاملے آخر ایک کس حیثیت سے ہیں کہ دونوں کے لیے قانون کا مزاج ایک ہی ہو۔ کیا ایک ذمی، یا ایک غلام، یا ایک سزا یافتہ آدمی کے لیے اس کی بیوی کا معاملہ کسی آزاد اہل شہادت مسلمان کے معاملے سے کچھ بھی مختلف یا اہمیت اور نتائج میں کچھ بھی کم ہے؟ اگر وہ اپنی آنکھوں سے کسی کے ساتھ اپنی بیوی کو ملوٹ دیکھ لے، یا اس کو یقین ہو کہ اس کی بیوی غیر سے حاملہ ہے تو کون سی معقول وجہ ہے کہ اسے لعان کا حق نہ دیا جائے؟ اور یہ حق اس سے سلب کرنے کے بعد ہمارے قانون میں اس کے لیے اور کیا چارہ کار ہے؟ قرآن مجید کا منشاء تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ جوڑوں کو اس پیچیدگی سے نکالنے کی ایک

صورت پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں بیوی کی حقیقی بدکاری یا ناجائز حمل سے ایک شوہر، اور شوہر کے جھوٹے الزام یا اولاد کے نسب سے بے جا انکار کی بدولت ایک بیوی بتلا ہو جائے۔ یہ ضرورت صرف اہل شہادت آزاد مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے، اور قرآن کے الفاظ میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کو صرف ان ہی تک محدود کرنے والی ہو۔ رہایہ استدلال کہ قرآن نے لعan کی قسموں کو شہادت قرار دیا ہے اس لیے شہادت کی شرائط یہاں عائد ہوں گی، تو اس کا تقاضا پھر یہ ہے کہ اگر عادل مقبول الشہادت شوہر قسمیں کھالے اور عورت قسم کھانے سے پہلو تھی کرے تو عورت کو رجم کر دیا جائے، کیونکہ اس کی بدکاری پر شہادت قائم ہو چکی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس صورت میں حفظیہ رجم کا حکم نہیں لگاتے۔ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ خود بھی ان قسموں کو بعینہ شہادت کی حیثیت نہیں دیتے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ خود قرآن بھی ان قسموں کو شہادت کے لفظ سے تعبیر کرنے کے باوجود شہادت نہیں قرار دیتا اور نہ عورت کو چار کے بجائے آٹھ قسمیں کھانے کا حکم دیتا۔

(۵) لعan مغض کنایے اور استعارے یا اظہار شک و شبه پر لازم نہیں آتا، بلکہ صرف اس صورت میں لازم آتا ہے جبکہ شوہر صریح طور پر زنا کا الزام عائد کرے یا صاف الفاظ میں پچ کو اپنا بچہ تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ امام مالک[ؓ] اور لیث بن سعد اس پر یہ مزید شرط بڑھاتے ہیں کہ قسم کھاتے وقت شوہر کو یہ کہنا چاہیے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بیوی کو زنا میں مبتلا دیکھا ہے۔ لیکن یہ قید بے بنیاد ہے۔ اس کی کوئی اصل نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔

(۶) اگر الزام لگانے کے بعد شوہر قسم کھانے سے پہلو تھی کرے تو امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ اسے قید کر دیا جائے گا اور جب تک وہ لعan نہ کرے یا اپنے الزام کا جھوٹا ہونا نہ مان لے، اسے نہ چھوڑا جائے گا، اور جھوٹ مان لینے کی صورت میں اس کو حد قذف لگانی جائے گی۔ اس کے برعکس امام مالک[ؓ]

شافعی، حسن بن صالح اور لیث بن سعد کی رائے یہ ہے کہ لعان سے پہلو تھی کرنا خود ہی اقرار کذب ہے اس لیے حد قذف واجب آجاتی ہے۔

(۷) اگر شوہر کے قسم کھاچنے کے بعد عورت لعان سے پہلو تھی کرے تو حقیقیہ کی رائے یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائے اور اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک وہ لعان نہ کرے، یا پھر زنا کا اقرار نہ کر لے۔ دوسری طرف مذکورہ بالا انہمہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں اسے رجم کر دیا جائے گا۔ ان کا استدلال قرآن کے اس ارشاد سے ہے کہ عورت سے عذاب صرف اس صورت میں دفع ہو گا جبکہ وہ بھی قسم کھالے۔ اب چونکہ وہ قسم نہیں کھاتی اس لیے لامحالة وہ عذاب کی مستحق ہے۔ لیکن اس دلیل میں کمزوری یہ ہے کہ قرآن یہاں "عذاب" کی نوعیت تجویز نہیں کرتا بلکہ مطلقاً سزا کا ذکر کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ سزا سے مراد یہاں زنا ہی کی سزا ہو سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زنا کی سزا کے لیے قرآن نے صاف الفاظ میں چار گواہوں کی شرط لگائی ہے۔ اس شرط کو محض ایک شخص کی چار قسمیں پورا نہیں کر دیتیں۔ شوہر کی قسمیں اس بات کے لیے تو کافی ہیں کہ وہ خود قذف کی سزا سے بچ جانے اور عورت پر لعان کے احکام مترتب ہو سکیں، مگر اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ ان سے عورت پر زنا کا الزام ثابت ہو جائے۔ عورت کا جوابی قسمیں کھانے سے انکار شبه ضرور پیدا کرتا ہے اور بڑا قوی شبه پیدا کر دیتا ہے، لیکن شبہات پر حدود جاری نہیں کی جاسکتیں۔ اس معاملہ کو مرد کی حد قذف پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا قذف تو ثابت ہے، جبھی تو اس کو لعان پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے بر عکس عورت پر زنا کا الزام ثابت نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے اپنے اقرار یا چار یعنی شہادتوں کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۸) اگر لعان کے وقت عورت حاملہ ہو تو امام احمد کے نزدیک لعان بجائے خود اس بات کے لیے کافی ہے کہ مرد اس حمل سے بری الذمہ ہو جائے اور بچہ اس کا قرار نہ پائے قطع نظر اس سے کہ مرد نے حمل کو

قبول کرنے سے انکار کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ امام شافعیؓ کہتے ہیں کہ مرد کا الزام زنا اور نفی حمل دونوں ایک چیز نہیں ہیں، اس لیے مرد جب تک حمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے صریح طور پر انکار نہ کرے وہ الزام زنا کے باوجود اسی کا قرار پائے گا کیونکہ عورت کے زانیہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو حمل بھی زنا ہی کا ہو۔

(۹) امام مالک، امام شافعیؓ اور امام احمد دوران حمل میں مرد کو نفی حمل کی اجازت دیتے ہیں اور اس بنیاد پر لعan کو جائز رکھتے ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اگر مرد کے الزام کی بنیاد زنانہ ہو بلکہ صرف یہ ہو کہ اس نے عورت کو ایسی حالت میں حاملہ پایا ہے جب کہ اس کے خیال میں حمل اس کا نہیں ہو سکتا تو اس صورت میں لعan کے معاملے کو وضع حمل تک ملتوی کر دینا چاہیے، کیونکہ بسا اوقات کوئی بیماری حمل کا شے پیدا کر دیتی ہے اور در حقیقت حمل ہوتا نہیں ہے۔

(۱۰) اگر باپ بچے کے نسب سے انکار کرے تو بالاتفاق لعan لازماً آتا ہے۔ اور اس امر میں بھی اتفاق ہے کہ ایک دفعہ بچے کو قبول کر لینے کے بعد (خواہ یہ قبول کر لینا صریح الفاظ میں ہو یا قبولیت پر دلالت کرنے والے افعال، مثلاً پیدائش پر مبارک باد لینے یا بچے کے ساتھ پدرانہ شفقت برتنے اور اس کی پرورش سے دلچسپی لینے کی صورت میں) پھر باپ کو انکار نسب کا حق نہیں رہتا، اور اگر کرے تو حد قذف کا مستحق ہو جانا ہے۔ مگر اس امر میں اختلاف ہے کہ باپ کو کس وقت تک انکار نسب کا حق حاصل ہے۔ امام مالک کے نزدیک اگر شوہر اس زمانے میں گھر پر موجود رہا ہے جبکہ بیوی حاملہ تھی تو زمانہ حمل سے لے کر وضع حمل تک اس کے لیے انکار کا موقع ہے، اس کے بعد وہ انکار کا حق نہیں رکھتا۔ البتہ اگر وہ غائب تھا اور اس کے پیچے ولادت ہوئی تو جس وقت اسے علم ہو وہ انکار کر سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر پیدائش کے بعد ایک دو روز کے اندر وہ انکار کرے تو لعan کر کے وہ بچے کی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا، لیکن اگر سال دو

سال بعد انکار کرے تو لعan ہو گا مگر وہ بچے کی ذمہ داری سے بری نہ ہو سکے گا۔ امام ابو یوسف کے نزدیک ولادت کے بعد، یا ولادت کا علم ہونے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر باب کو انکار نسب کا حق ہے، اس کے بعد یہ حق ساقط ہو جائے گا۔ مگر یہ چالیس دن کی قید بے معنی ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام ابو حنیفہ نے فرمائی ہے کہ ولادت کے بعد یا اس کا علم ہونے کے بعد ایک دو روز کے اندر، ہی انکار نسب کیا جا سکتا ہے، والا یہ کہ اس میں کوئی ایسی رکاوٹ ہو جسے معقول رکاوٹ تسلیم کیا جاسکے۔

(۱۱) اگر شوہر طلاق دینے کے بعد مطلقة بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک لعan نہیں ہو گا بلکہ اس پر قذف کا مقدمہ قائم کیا جائے گا، کیونکہ لعan زوجین کے لیے ہے اور مطلقة عورت اس کی بیوی نہیں ہے۔ الایہ کہ طلاق رجعی ہو اور مدت رجوع کے اندر وہ الزام لگائے۔ مگر امام مالک کے نزدیک یہ قذف صرف اس صورت میں ہے جبکہ کسی حمل یا بچے کا نسب قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ درمیان میں نہ ہو۔ ورنہ مرد کو طلاق بائن کے بعد بھی لعan کا حق حاصل ہے کیونکہ وہ عورت کو بدنام کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود ایک ایسے بچے کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے لعan کر رہا ہے جسے وہ اپنا نہیں سمجھتا۔ قریب قریب یہی رائے امام شافعی گی بھی ہے۔

(۱۲) لعan کے قانونی نتائج میں سے بعض متفق علیہ ہیں، اور بعض میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ متفق علیہ نتائج یہ ہیں: عورت اور مرد دونوں کسی سزا کے مستحق نہیں رہتے۔ مرد بچے کے نسب کا منکر ہو تو بچہ صرف ماں کا قرار پائے گا، نہ باپ کی طرف منسوب ہو گا نہ اس سے میراث پائے گا، ماں اس کی وارث ہو گی اور وہ ماں کا وارث ہو گا۔ عورت کو زانیہ اور اس کے بچے کو ولد الزنا کہنے کا کسی کو حق نہ ہو گا، خواہ لعan کے وقت اس کے حالات ایسے ہی کیوں نہ ہوں کہ لوگوں کو اس کے زانیہ ہونے میں شک نہ رہے۔ جو شخص لعan کے بعد اس پر یا اس کے بچے پر سابق الزام کا اعادہ کرے گا وہ حد کا مستحق ہو گا۔ عورت کا مہر ساقط نہ ہو

گا۔ عورت دوران عدت میں مرد سے نفقة اور مسکن پانے کی حق دار نہ ہو گی۔ عورت اس مرد کے لیے حرام ہو جائے گی۔

اختلاف دو مسئللوں میں ہے: ایک یہ کہ لعan کے بعد عورت اور مرد کی علیحدگی کیسے ہو گی؟ دوسرے یہ کہ لعan کی بنا پر علیحدہ ہو جانے کے بعد کیا ان دونوں کا پھر مل جانا ممکن ہے؟ پہلے مسئلے میں امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جس وقت مرد لعan سے فارغ ہو جائے اسی وقت فرقت آپ سے آپ واقع ہو جاتی ہے خواہ عورت جوابی لعan کرے نہ کرے۔ امام مالک، لیث بن سعد اور رُفر رَحْمَةُ اللَّهِ كَبِيْرٌ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں جب لعan سے فارغ ہوں تب فرقت واقع ہوتی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد رَحْمَةُ اللَّهِ كَبِيْرٌ کہتے ہیں کہ لعan سے فرقت آپ ہی آپ واقع نہیں ہو جاتی بلکہ عدالت کے تفریق کرانے سے ہوتی ہے۔ اگر شوہر خود طلاق دے دے تو بہتر، ورنہ حاکم عدالت ان کے درمیان تفریق کا اعلان کرے گا۔ دوسرے مسئلے میں امام مالک، ابو یوسف، زفر، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، شافعی، احمد بن حنبل اور حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ لعan سے جوز و جلین جدا ہوئے ہوں وہ پھر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں، دوبارہ وہ باہم نکاح کرنا بھی چاہیں تو کسی حال میں نہیں کر سکتے۔ یہی رائے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کی بھی ہے۔ بخلاف اس کے سعید بن مسیب، ابراہیم نخنی، شعبی، سعید بن جبیر، ابو حنیفہ اور محمد رَحْمَةُ اللَّهِ كَبِيْرٌ کی رائے یہ ہے کہ اگر شوہر اپنا جھوٹ مان لے اور اس پر حد قذف جاری ہو جائے تو پھر ان دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے کے لیے حرام کرنے والی چیز لعan ہے۔ جب تک وہ اس پر قائم رہیں، حرمت بھی قائم رہے گی۔ مگر جب شوہر اپنا جھوٹ مان کر سزا پا گیا تو لعan ختم ہو گیا اور حرمت بھی اٹھ گئی۔

رکوٰہ ۲۶

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عَصِبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ
 بِكُلِّ امْرٍ مِّنْهُمْ مَا أَكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّ كِبْرَةً مِّنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢١﴾

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ
 لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةٍ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمْ
 الْكُذِبُونَ ﴿٢٢﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَكُمْ فِي مَا
 أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِالْسِنَتِ كُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ
 كُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيْنَا ﴿٢٤﴾ وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿٢٥﴾ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا
 يَكُونُ لَنَا آنَّ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا ﴿٢٦﴾ سُبْحَنَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴿٢٧﴾ يَعْظُمُ كُمْ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا
 لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٨﴾ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ كُمُ الْأَيْتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٩﴾ إِنَّ
 الَّذِينَ يُحِبُّونَ آنَّ تَشْيِيعَ الْفَاحِشَةِ فِي الَّذِينَ أَمْنَوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
 وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَآنَّتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ رَءُوفٌ

رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾

۲۶ رکو

جو لوگ یہ بہتان گھٹ لائے ہیں ⁸ وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ ⁹ اس واقعے کو اپنے حق میں شرنہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے۔ ¹⁰ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا، اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا ¹¹ اس کے لیے عذابِ عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے شناختا اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا ¹² اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟ ¹³ وہ لوگ ^{﴿﴾} اپنے الزام کے ثبوت میں ^{﴿﴾} چار گواہ کیوں نہ لائے؟

اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ ¹⁴ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلتا۔ ^{﴿﴾} ذرا غور تو کرو، اُس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے ^{﴿﴾} جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کی متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔

کیوں نہ اُسے سُنْتَہی تم نے کہہ دیا کہ ”ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سُبْحَانَ اللَّهِ، يَا تَوَكِّلْ بہتانِ عظیم ہے۔“ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ ¹⁵

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فخش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، ¹⁶ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ¹⁷ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے، ^{﴿﴾} تو یہ چیز جو ابھی تمہارے اندر پھیلانی گئی تھی بدترین نتائج دکھادیتی ہے۔ ۴

سورة النور حاشیہ نمبر: 8 ▲

اشارہ ہے اس الزام کی طرف جو حضرت عائشہؓ پر لگایا گیا تھا۔ اس کو افک کے لفظ سے تعبیر کرنا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس الزام کی مکمل تردید ہے۔ افک کے معنی ہیں بات کو الٹ دینا، حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنادینا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ قطعی جھوٹ اور افتراء کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کسی الزام کے لیے بولا جائے تو اس کے معنی سراسر بہتان کے ہیں۔

یہاں سے اس واقعہ پر کلام شروع ہوتا ہے جو اس سورے کے نزول کا اصل سبب تھا۔ دیباچے میں ہم اس کا ابتدائی قصہ خود حضرت عائشہؓ کی روایت سے نقل کر آئے ہیں۔ بعد کی داستان بھی انھی کی زبان سے سنیے۔ فرماتی ہیں: اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔ نبی ﷺ سخت اذیت میں مبتلا رہے، میں روتی رہی، میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے، آخر کار ایک روز حضور ﷺ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپ ﷺ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابو بکر اور اُمّ رُومان (حضرت عائشہؓ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کُن بات ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھے گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا عائشہ، مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو اُمید ہے کہ اللہ تمہاری برآت ظاہر فرمادے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو، بندہ جب اپنے گناہ کا معرف ہو کر توبہ کرتا تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے اپنے والد سے عرض کیا: آپ رسول ﷺ اللہ کی بات کا جواب دیں۔ انہوں نے فرمایا میں، میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا: آپ ہی کچھ کہیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی: آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے، اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔۔۔۔۔ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔۔۔۔۔ تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ

مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراض کروں جو میں نے نہیں کی۔ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی۔ تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا۔ آخر میں نے کہا اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؐ کے والد نے کہی تھی **فَصَبْرُّ جَمِيلٌ** (اشارة ہے اس واقعہ کی طرف جبکہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے ان کے بیٹے بن یمین پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا۔ سورہ یوسف، رکوع ۱۰ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے) یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ ﷺ کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برآت ظاہر فرمادے گا۔ اتنے میں یکا یک حضور ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ ﷺ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی۔ مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضور ﷺ بے حد خوش تھے۔ آپ نے ہنسنے ہونے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ، اللہ نے تمہاری برآت نازل فرمادی۔ اور اس کے بعد حضور ﷺ نے دس آیتیں سنائیں (یعنی آیت نمبر 11 سے نمبر 21 تک)۔ میری والدہ نے کہا کہ انھوں اور رسول اللہ ﷺ کا شکر یہ ادا کرو۔ میں نے کہا میں نہ ان کا شکر یہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا، بلکہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برآت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا۔ (واضح رہے کہ یہ کسی

ایک روایت کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں جتنی روایتیں حضرت عائشہؓ سے اس سلسلے میں مروی ہیں ان سب کو جمع کر کے ہم نے ان کا خلاصہ نکال لیا ہے)۔

اس موقع پر یہ نکتہ لطیف بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت عائشہؓ کی برآت بیان کرنے سے پہلے پورے ایک رکوع میں زنا اور قذف اور لعan کے احکام بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے دراصل اس حقیقت پر متنبہ فرمایا ہے کہ زنا کے الزام کا معاملہ کوئی تفریحی مشغلہ نہیں ہے جسے نقل محفل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک نہایت سنگین بات ہے۔ الزام لگانے والے کا الزام اگر سچا ہے تو وہ گواہی لائے۔ زانی اور زانیہ کو انتہائی ہولناک سزادی جائے گی۔ اگر جھوٹا ہے تو الزام لگانے والا اس لاک ہے کہ اس کی پیٹھ پر 80 کوڑے برسا دیے جائیں تاکہ آئندہ وہ یا کوئی اور ایسی جرأت نہ کرے۔ اور یہ الزام اگر شوہر لگائے تو عدالت میں لعan کر کے اسے معاملہ صاف کرنا ہو گا۔ اس بات کو زبان سے نکال کر کوئی شخص بھی خیریت سے بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ مسلم معاشرہ ہے جسے دنیا میں بھلائی قائم کرنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ اس میں نہ زنا ہی تفریح بن سکتی ہے اور نہ اس کے چرچے ہی خوش باشی اور دل لگی کے موضوع قرار پاسکتے ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 9 ▲

روایات میں صرف چند آدمیوں کے نام ملتے ہیں جو یہ افوایں پھیلارہے تھے۔ عبد اللہ بن ابی زید بن رفاعة (جو غالباً رفاعة بن زید یہودی منافق کا بیٹا تھا)۔ مسٹح بن اثاثہ۔ حسان بن ثابت اور حمنة بنت جحش۔ ان میں سے پہلے دو منافق تھے اور باقی تین مومن تھے جو غلطی اور کمزوری سے اس فتنے میں پڑ گئے تھے۔ ان کے سوا اور جو لوگ اس گناہ میں کم و بیش مبتلا ہوئے ان کا ذکر حدیث و سیرت کی کتابوں میں نظر سے نہیں گزرا۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 10 ▲

مطلوب یہ ہے کہ گھبراؤ نہیں، مนา فقین نے اپنی دانست میں تو یہ بڑے زور کا وار تم پر کیا ہے مگر ان شاء اللہ یہ ان ہی پر الٹا پڑے گا اور تمہارے لیے مفید ثابت ہو گا۔ جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، منا فقین نے یہ شو شہ اس لیے چھوڑا تھا کہ مسلمانوں کو اس میدان میں شکست دیں جو ان کے تفوق کا اصل میدان تھا، یعنی اخلاق جس میں فائق ہونے ہی کی وجہ سے وہ ہر میدان میں اپنے حریفوں سے بازی لیے جا رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی مسلمانوں کے لیے سبب خیر بنا دیا۔ اس موقع پر ایک طرف نبی ﷺ نے، دوسری طرف حضرت ابو بکرؓ اور ان کے خاندان والوں نے، اور تیسرا طرف عام اہل ایمان نے جو طرز عمل اختیار کیا اس سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ یہ لوگ برائی سے کس قدر پاک، کیسے ضابطہ و متحمل، کیسے انصاف پسند اور کس درجہ کریم النفس واقع ہوئے ہیں۔ نبی ﷺ کا ایک اشارہ ان لوگوں کی گرد نیں اڑادینے کے لیے کافی تھا جنہوں نے آپ ﷺ کی عزت پر یہ حملہ کیا تھا، مگر مہینہ بھر تک آپ ﷺ صبر سے سب کچھ برداشت کرتے رہے، اور جب اللہ کا حکم آگیا تو صرف ان تین مسلمانوں کو، جن پر جرم قذف ثابت تھا، حد گلوادی، مانا فقین کو پھر بھی کچھ نہ کہا۔ حضرت ابو بکرؓ کا اپنا رشتہ دار، جس کی اور جس کے گھر بھر کی وہ کفالت بھی فرماتے تھے، ان کے دل و جگر پر یہ تیر چلاتا رہا، مگر اللہ کے اس نیک بندے نے اس پر ابھی نہ برا دری کا تعلق منقطع کیا، نہ اس کی اور اس کے خاندان کی مدد ہی بند کی۔ ازواج مطہرات میں سے کسی نے بھی سوکن کی بدنامی میں ذرہ برابر حصہ نہ لیا، بلکہ کسی نے اس پر ادنی درجے میں بھی اپنی رضا اور پسند کا، یا کم از کم قبولیت کا اظہار تک نہ کیا۔ حتیٰ کہ حضرت زینبؓ کی سگی بہن حمنہ بنت جحش محض ان کی خاطر ان کی سوکن کو بدنام کر رہی تھیں، مگر خود انہوں نے سوکن کے حق میں کلمہ خیر ہی کہا۔ حضرت عائشہؓ کی اپنی روایت ہے کہ ازواج رسول اللہ ﷺ میں سب سے زیادہ زینبؓ ہی سے میرا مقابلہ رہتا تھا، مگر واقعہ افک کے سلسلے میں جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ عائشہؓ کے متعلق تم کیا جانتی

ہو، تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ، خدا کی قسم! میں اس کے اندر بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہؓ کی اپنی شرافت نفس کا حال یہ تھا کہ حضرت حسان بن ثابت نے انہیں بدنام کرنے میں نمایاں حصہ لیا، مگر وہ ہمیشہ ان کے ساتھ عزت اور تواضع ہی سے پیش آتی رہیں۔ لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے آپ کو بدنام کیا تھا، تو یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو دشمن اسلام شعراء کو رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی طرف سے منہ توڑ جواب دیا کرتا تھا۔ یہ تھا ان لوگوں کا حال جن کا اس معاملے سے براہ راست تعلق تھا۔ اور عام مسلمانوں کی پاکیزہ نفسی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری سے ان کی بیوی نے جب ان افواہوں کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے "ایوب کی ماں! اگر تم عائشہ کی جگہ اس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟" بولیں "خدا کی قسم! میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی"۔ حضرت ابو ایوب نے کہا "تو عائشہ تم سے بدرجہ ہابھتر ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفویں کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کر سکتا تھا، صفویں تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے۔" اس طرح منافقین جو کچھ چاہتے تھے، نتیجہ اس کے بالکل بر عکس نکلا اور مسلمانوں کا اخلاقی تفوق پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گیا۔

پھر اس میں خیر کا ایک اور پہلو بھی تھا، اور وہ یہ کہ یہ واقعہ اسلام کے قوانین و احکام اور تمدنی ضوابط میں بڑے اہم اضافوں کا موجب بن گیا۔ اس کی بدولت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ہدایات حاصل ہوئیں جن پر عمل کر کے مسلم معاشرے کو ہمیشہ کے لیے برا یوں کی پیداوار اور ان کی اشاعت سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے، اور پیدا ہو جائیں تو ان کا بروقت تدارک کیا جاسکتا ہے۔

مزید برآں اس میں خیر کا پہلو یہ بھی تھا کہ تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ نبی ﷺ غائب داں نہیں ہیں، جو کچھ اللہ بتاتا ہے وہی کچھ جانتے ہیں، اس کے مساوا آپ ﷺ کا علم اتنا ہی کچھ ہے جتنا ایک بشر کا ہو سکتا ہے، ایک مہینے تک آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے معاملے میں سخت پریشان رہے۔ کبھی

خادمہ سے پوچھتے تھے، کبھی ازواج مطہرات سے، کبھی حضرت علی سے اور کبھی حضرت اسماء سے۔ آخر کار حضرت عائشہؓ سے فرمایا تو یہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ گناہ کیا ہے تو توبہ کرو، اور نہیں کیا تو امید ہے کہ اللہ تمہاری بے گناہی ثابت کر دے گا۔ اگر آپ عالم الغیب ہوتے تو یہ پریشانی اور یہ پوچھ گچھ اور یہ تلقین توبہ کیوں ہوتی؟ البتہ جب وحی خداوندی نے حقیقت بتا دی تو آپ ﷺ کو وہ علم حاصل ہو گیا جو مہینہ بھر تک حاصل نہ تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے براہ راست تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اس غلو اور مبالغہ سے بچانے کا انتظام فرمادیا جس میں عقیدت کا انداز ہاجوش بالعموم اپنے پیشواؤں کے معاملے میں لوگوں کو مبتلا کر دیتا ہے۔ بعید نہیں کہ مہینے بھر تک وحی نہ سمجھنے میں اللہ تعالیٰ کے پیش نظر یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو۔ اول روز ہی وحی آجائی تو یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکتا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ 595 تا 598)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 11 ▲

یعنی عبد اللہ بن ابی جواس الزام کا اصل مصنف اور فتنے کا اصل بانی تھا۔ بعض روایات میں غلطی سے حضرت حسان بن ثابت کو اس آیت کا مصدقہ بتایا گیا ہے، مگر یہ راویوں کی اپنی ہی غلط فہمی ہے ورنہ حضرت حسان کی کمزوری اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ منافقوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنے میں مبتلا ہو گئے۔ حافظ ابن کثیر نے صحیح کہا ہے کہ اگر یہ روایت بخاری میں نہ ہوتی تو قابل ذکر تک نہ تھی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا جھوٹ، بلکہ بہتان یہ ہے کہ بنی عمیہ نے حضرت علی کو اس آیت کا مصدقہ قرار دیا۔ بخاری، طبرانی، اور بیہقی میں ہشام بن عبد الملک اُموی کا یہ قول، منقول ہے کہ **الَّذِي تَوَلَّ كِبْرَةً** کے مصدقہ علی بن ابی طالب ہیں۔ حالانکہ حضرت علی کا سرے سے اس فتنے میں کوئی حصہ ہی نہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ انہوں نے جب نبی ﷺ کو بہت پریشان دیکھا تو حضور ﷺ کے مشورہ لینے پر عرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں آپ ﷺ پر کوئی تنگی تو نہیں رکھی ہے۔ عورتیں بہت ہیں۔ آپ چاہیں تو عائشہ کو طلاق دے کر

دوسرانکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اس الزام کی تصدیق فرمائی تھی جو حضرت عائشہؓ پر لگایا جا رہا تھا۔ ان کا مقصد صرف آنحضرت ﷺ کی پریشانی کو رفع کرنا تھا۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 12 ▲

دوسراترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے لوگوں، یا اپنی ملت اور اپنے معاشرے کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، اور اس ذو معنی فقرے کے استعمال میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے خوب سمجھ لینا چاہیے۔ جو صورت معاملہ حضرت عائشہؓ اور صفوان بن معطل کے ساتھ پیش آئی تھی وہ یہی تو تھی کہ قافلے کی ایک خاتون (قطع نظر اس سے کہ وہ رسول کی بیوی تھیں) اتفاق سے پچھے رہ گئی تھیں اور قافلے ہی کا ایک آدمی جو خود اتفاق سے پچھے رہ گیا تھا، انہیں دیکھ کر اپنے اونٹ پر ان کو بٹھا لایا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ معاذ اللہ یہ دونوں تنہا ایک دوسرے کو پا کر گناہ میں مبتلا ہو گئے تو اس کا یہ کہنا اپنے ظاہر الفاظ کے پچھے دو اور مفروضے بھی رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ قائل (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) اگر خود اس جگہ ہوتا تو کبھی گناہ کیے بغیر نہ رہتا، کیونکہ وہ اگر گناہ سے رکا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اسے صنف مقابل کا کوئی فرد اس طرح تنہائی میں ہاتھ نہ آگیا، ورنہ ایسے نادر موقع کو وہ چھوڑنے والا نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جس معاشرے سے وہ تعلق رکھتا ہے اس کی اخلاقی حالت کے متعلق اس کا گمان یہ ہے کہ یہاں کوئی عورت بھی ایسی نہیں ہے اور نہ کوئی مرد ایسا ہے جسے اس طرح کا کوئی موقع پیش آجائے اور وہ گناہ سے باز رہ جائے۔ یہ تو اس عورت میں ہے جبکہ معاملہ محض ایک مرد اور ایک عورت کا ہو۔ اور بافرض اگر وہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہوں، اور عورت جو اتفاقاً قافلے سے بچھڑ گئی تھی، اس مرد کے کسی دوست یا رشتہ دار یا ہمسائے یا واقف کار کی بیوی بہن، یا بیٹی ہو تو معاملہ اور بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی بھری ہو جاتے ہیں کہ کہنے والا خود اپنی ذات کے متعلق بھی اور اپنے معاشرے کے متعلق بھی ایسا سخت گھناؤنا تصور رکھتے ہے جسے شرافت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ کون بھلا آدمی یہ سوچ

سکتا ہے کہ اس کے کسی دوست یا ہمسائے یا واقف کار کے گھر کی کوئی عورت اگر اتفاق سے کہیں بھولی بھٹکی اسے راستے میں مل جائے تو وہ پہلا کام بس اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے ہی کا کرے گا، پھر کہیں اسے گھر پہنچانے کی تدبیر سوچے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ہزار گناز یادہ سخت تھا۔ خاتون کوئی اور نہ تھیں، رسول اللہ ﷺ کی بیوی تھیں جنہیں ہر مسلمان اپنی ماں سے بڑھ کر احترام کے لاکن سمجھتا تھا، جنہیں اللہ نے خود ہر مسلمان پر ماں کی طرح حرام قرار دیا تھا۔ مرد نہ صرف یہ کہ اسی قافلے کا ایک آدمی، اسی فوج کا ایک سپاہی اور اسی شہر کا ایک باشندہ تھا، بلکہ وہ مسلمان تھا، ان خاتون کے شوہر کو اللہ کار رسول اور اپنا ہادی و پیشوامانتا تھا، اور ان کے فرمان پر جان قربان کرنے کے لیے جنگ بدر جیسے خطرناک معرکے میں شریک ہو چکا تھا۔ اس صورت حال میں تو اس قول کا ذہنی پس منظر گھناؤنے نے پن کی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس سے بڑھ کر کسی گندے تخیل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرمرا رہا ہے کہ مسلم معاشرے کے جن افراد نے یہ بات زبان سے نکالی یا اسے کم از کم شک کے قابل خیال کیا انہوں نے خود اپنے نفس کا بھی بہت برا تصور قائم کیا اور اپنے معاشرے کے لوگوں کو بھی بڑے ذلیل اخلاق و کردار کا مالک سمجھا۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 13 ▲

یعنی یہ بات تو قابل غور تک نہ تھی۔ اسے تو سنتے ہی ہر مسلمان کو سراسر جھوٹ اور کذب و افتراء کہہ دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص یہاں یہ سوال کرے کہ جب یہ بات تھی تو خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق نے اسے کیوں نہ اول روز ہی جھٹلادیا اور کیوں انہوں نے اسے اتنی اہمیت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شوہر اور باب کی پوزیشن عام آدمیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک شوہر سے بڑھ کر کوئی اپنی بیوی کو نہیں جان سکتا اور ایک شریف و صالح بیوی کے متعلق کوئی صحیح الدماغ شوہر لوگوں کے بہتانوں پر فی الواقع بد گمان نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس کی بیوی پر الزام لگا دیا جائے تو وہ اس مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اسے بہتان کہہ کر رد کر بھی دے تو کہنے والوں کی زبان نہ رکے گی، بلکہ وہ اس پر ایک اور رد ایہ چڑھائیں گے

کہ بیوی نے میاں صاحب کی عقل پر کیسا پردہ ڈال رکھا ہے، سب کچھ کر رہی ہے اور میاں یہ سمجھتے ہیں کہ میری بیوی بڑی پاک دامن ہے۔ ایسی ہی مشکل ماں باپ کو پیش آتی ہے۔ وہ غریب اپنی بیٹی کی عصمت پر صریح جھوٹے الزام کی تردید میں اگر زبان کھولیں بھی تو بیٹی کی پوزیشن صاف نہیں ہوتی۔ کہنے والے یہ کہیں گے کہ ماں باپ ہیں، اپنی بیٹی کی حمایت نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ یہ چیز تھی جو رسول اللہ ﷺ میں کوئی شک اور حضرت ابو بکر اور امّ رومان کو اندر رہی اندر غم سے گھلانے دے رہی تھی۔ ورنہ حقیقت میں کوئی شک ان کو لا حق نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے تو خطبے ہی میں صاف فرمادیا تھا کہ میں نے نہ اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق یہ الزام لگایا جا رہا ہے۔

سورة المنور حاشیہ نمبر: 14 ▲

"اللہ کے نزدیک" یعنی اللہ کے قانون میں، اللہ کے قانون کے مطابق۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو الزام بجائے خود جھوٹا تھا، اس کا جھوٹ ہونا اس بات پر مبنی نہ تھا کہ یہ لوگ گواہ نہیں لائے ہیں۔

اس جگہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہاں الزام کے غلط ہونے کی دلیل اور بنیاد محسن گواہوں کی غیر موجودگی کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم بھی صرف اس وجہ سے اس کو صریح بہتان قرار دو کہ الزام لگانے والے چار گواہ نہیں لائے ہیں۔ یہ غلط فہمی اس صورت واقعہ کو نگاہ میں نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے جو فی الواقع وہاں پیش آئی تھی۔ الزام لگانے والوں نے الزام اس وجہ سے نہیں لگایا تھا کہ انہوں نے، یا ان میں سے کسی شخص نے وہ بات دیکھی تھی جو وہ زبان سے نکال رہے تھے، بلکہ صرف اس بنیاد پر اتنا بڑا الزام تصنیف کر ڈالا تھا کہ حضرت عائشہؓ قالے سے پیچھے رہ گئی تھیں اور صفوان بعد میں ان کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے قالے میں لے آئے۔ کوئی صاحب عقل آدمی بھی اس موقع پر یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا اس طرح پیچھے رہ جانا، معاذ اللہ کسی ساز باز کا نتیجہ تھا۔ ساز باز کرنے والے اس طریقہ سے تو ساز باز نہیں کیا کرتے کہ سالار لشکر کی بیوی چکپے سے قالے کے پیچھے ایک شخص کے ساتھ رہ

جائے اور پھر وہی شخص اس کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر دن دھڑے، ٹھیک دوپہر کے وقت لیے ہوئے علانية لشکر کے پڑاؤ پر پہنچے۔ یہ صورت حال خود ہی ان دونوں کی مخصوصیت پر دلالت کر رہی تھی۔ اس حالت میں اگر الزام لگایا جاسکتا تھا تو صرف اس بنیاد پر ہی لگایا جاسکتا تھا کہ کہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے کوئی معاملہ دیکھا ہوا۔ ورنہ قرآن، جن پر ظالموں نے الزام کی بنار کھی تھی، کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رکھتے تھے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 15 ▲

ان آیات سے، اور خصوصاً اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ "مُوْمِنُوْنَ مُرْدُوْنَ اُوْرُ عُوْرُوْتُوْنَ نے اپنے گروہ کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا" یہ قاعدہ کلیہ نکلتا ہے کہ مسلم معاشرے میں تمام معاملات کی بنا حسن ظن پر ہونی چاہیے، اور سوء ظن صرف اس حالت میں کیا جانا چاہیے جبکہ اس کے لیے کوئی ثبوتی و ایجادی بنیاد ہو۔ اصول یہ ہے کہ ہر شخص بے گناہ ہے جب تک کہ اس کے مجرم ہونے یا اس پر جرم کا شہر کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو۔ اور ہر شخص اپنی بات میں سچا ہے جب تک کہ اس کے ساقط الاعتبار ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 16 ▲

موقع و محل کے لحاظ سے تو آیت کا براہ راست مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے الزامات گھڑ کر اور انہیں اشاعت دے کر مسلم معاشرے میں بد اخلاقی پھیلانے اور امت مسلمہ کے اخلاق پر دھبہ لگانے کی کوششیں کر رہے ہیں وہ سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن آیت کے الفاظ فحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ ان کا اطلاق عملاً بد کاری کے اڈے قائم کرنے پر بھی ہوتا ہے اور بد اخلاقی کی ترغیب دینے والے اور اس کے لیے جذبات کو اکسانے والے قصوں، اشعار، گانوں، تصویروں اور کھیل تماشوں پر بھی۔ نیز وہ کلب اور ہوٹل اور دوسرے ادارے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں جن میں مخلوط رقص اور مخلوط تفریحات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ یہ سب لوگ مجرم ہیں۔ صرف آخرت ہی میں نہیں دنیا

میں بھی ان کو سزا ملنی چاہیے۔ لہذا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعت نخش کے ان تمام ذرائع و وسائل کا سد باب کرے۔ اس کے قانون تعزیرات میں ان تمام افعال کو مستلزم سزا، قابل دست اندازی پولیس ہونا چاہیے جن کو قرآن یہاں پبلک کے خلاف جرائم قرار دے رہا ہے اور فیصلہ کر رہا ہے کہ ان کا ارتکاب کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 17 ▲

یعنی تم لوگ نہیں جانتے کہ اس طرح کی ایک ایک حرکت کے اثرات معاشرے میں کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں، کتنے افراد کو متاثر کرتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کا کس قدر نقصان اجتماعی زندگی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس چیز کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ لہذا اللہ پر اعتماد کرو اور جن برائیوں کی وہ نشان دہی کر رہا ہے انہیں پوری قوت سے مٹانے اور دبانے کی کوشش کرو۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں جن کے ساتھ رواداری برقراری جائے۔ دراصل یہ بڑی باتیں ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔

رکوٰ٢٦

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوطِ الشَّيْطَنِ ۖ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوطَ الشَّيْطَنِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ
بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۖ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةً مَا زَانِي مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا ۗ
وَلَكِنَّ اللَّهَ يُرِيكُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ سَهِيعٌ عَلَيْمٌ ۝ وَلَا يَأْتِي أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ
السَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولَى الْقُرْبَى وَالْمُسْكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَلَيَعْفُوا وَ
لَيَصْفَحُوا ۖ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ
الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ
تَشَهَّدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفَّى هُمُ اللَّهُ
دِيَنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ۝ الْخَيْثَتُ لِلْخَيْثِينَ وَالْخَبِيثُونَ
لِلْخَبِيثَتِ ۖ وَالْطَّيْبَتُ لِلْطَّيْبِينَ وَالْطَّيْبُونَ لِلْطَّيْبَتِ ۖ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ
لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

۳۶ رکوٰت

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ تو اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔ **18** مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے، اور اللہ سُنْنَةِ وَالا اور جاننے والا ہے۔

تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضل اور صاحبِ مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھابیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیلِ اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انھیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے۔ **20**

جو لوگ پاک دامن، بے خبر، **21** مومن عورتوں پر تھمتیں لگاتے ہیں ان پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوں کی گواہی دیں گے۔ **21A** اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھر پور دے دیگا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا۔

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے اُن باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں، **22** ان کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم۔ ۳۶

سورة النور حاشیہ نمبر: 18 ▲

یعنی شیطان تو تمہیں برائی کی نجاستوں میں آلوہ کرنے کے لیے اس طرح تلا بیٹھا ہے کہ اگر اللہ اپنے فضل و کرم سے تم کو نیک و بد کی تمیز نہ سمجھائے اور تم کو اصلاح کی تعلیم و توفیق سے نہ نوازے تو تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے بل بوتے پر پاک نہ ہو سکے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 19 ▲

یعنی اللہ کی یہ مشیت کہ وہ کسے پاکیزگی بخشنے، اندھا دھنڈ نہیں ہے بلکہ علم کی بنابر ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس میں بھلائی کی طلب موجود ہے اور کون برائی کی رغبت رکھتا ہے۔ ہر شخص اپنی خلوتوں میں جو باتیں کرتا ہے، انہیں اللہ سن رہا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے دل میں بھی جو کچھ سوچا کرتا ہے، اللہ اس سے بے خبر نہیں رہتا۔ اسی برآہ راست علم کی بنابر اللہ فیصلہ کرتا ہے کہ کسے پاکیزگی بخشنے اور کسے نہ بخشنے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 20 ▲

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مذکورہ بالا آیتوں میں جب اللہ تعالیٰ نے میری برأت نازل فرمادی تو حضرت ابو بکرؓ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ کے لیے مسٹر بن اُثاثہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے، کیونکہ انہوں نے نہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کیا اور نہ ان احسانات، ہی کی کچھ شرم کی جو وہ ساری عمر ان پر اور ان کے خاندان پر کرتے رہے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کو سنتے ہی حضرت ابو بکرؓ نے فوراً گہا: بلى والله ان انا نحب ان تغفر لنا ياربنا والله ضرور هم چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہماری خطائیں معاف فرمائے۔" - چنانچہ آپ نے پھر مسٹرؓ کی مدد شروع کر دی اور پہلے سے زیادہ ان پر احسان کرنے لگے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ قسم حضرت ابو بکرؓ کے علاوہ بعض اور صحابہؓ نے بھی کھالی تھی کہ جن جن لوگوں نے اس بہتان میں حصہ لیا ہے ان کی وہ کوئی مدد نہ کریں گے۔ اس آیت کے نزول کے بعد ان سب نے اپنے عہد سے رجوع کر لیا۔ اس طرح وہ تلخی آناؤ فاماً دور ہو گئی جو اس فتنے نے پھیلادی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ اس میں بھلائی نہیں ہے اور وہ اس سے رجوع کر کے وہ بات اختیار کر لے جس میں بھلائی ہے تو آیا اسے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں۔ فقہاء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہی قسم کا کفارہ ہے، اس کے سوا کسی اور کفارے کی ضرورت نہیں یہ لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر کو قسم توڑ دینے کا حکم دیا اور کفارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ اس کے علاوہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کو بھی وہ دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ من حلف علی یہیں فوائی غیرہا خیرا منها فلیات الذی هو خیر و ذلك کفارته۔ (جو شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے تو اسے وہی بات کرنی چاہیے جو بہتر ہے اور یہ بہتر بات کو اختیار کر لینا ہی اس کا کفارہ ہے)۔ دوسرا گروہ کہتا ہے قسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک صاف اور مطلق حکم فرمाचکا ہے (البقرہ، آیت 225 المائدہ، آیت 89) جسے اس آیت نے نہ تو منسونخ ہی کیا ہے اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر کوئی ترمیم ہی کی ہے۔ اس لیے وہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت ابو بکر کو قسم توڑ دینے کے لیے تو ضرور فرمایا ہے مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے۔ رہانی ﷺ کا ارشاد تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک غلط یا نامناسب بات کی قسم کھالینے سے جو گناہ ہوتا ہے وہ مناسب بات اختیار کر لینے سے دھل جاتا ہے۔ اس ارشاد کا مقصد کفارہ قسم کو ساقط کر دینا نہیں ہے، چنانچہ دوسری حدیث اس کی توجیہ کر دیتی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے من حلف الی یہیں فوائی غیرہا خیرا منها فلیات الذی هو خیر و لیکفر عن یہینہ (جس نے کسی بات کی قسم کھالی ہو، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، اسے چاہیے کہ وہی بات کرے جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ اور چیز ہے اور بھلائی نہ کرنے کے گناہ کا کفارہ اور چیز۔ ایک چیز کا کفارہ بھلائی کو

اختیار کر لینا ہے اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے خود مقرر کر دیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ ص، حاشیہ 46)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 21

اصل میں لفظ "غافلات" استعمال ہوا ہے جس سے مراد ہیں وہ سیدھی سادھی شریف عورتیں جو چھل بٹے نہیں جانتیں، جن کے دل پاک ہیں، جنہیں کچھ خبر نہیں کہ بد چلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے، جن کے حاشیہ خیال میں بھی یہ اندیشہ نہیں گزرتا کہ کبھی کوئی ان پر بھی الزام لگائیجھے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا ان سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو "موبقات" (تباه کن) ہیں۔ اور طبرانی میں حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا قذف المحسنة یہدم عمل مأة سنۃ ایک پاک دامن عورت پر تہمت لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کر دینے کے لیے کافی ہے"

سورة النور حاشیہ نمبر: 21A

تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، لیں، حاشیہ ۵۵، حم السجدہ، حاشیہ ۲۵۔

آپ کی سہولت کے لئے یہاں لکھ دیا گیا ہے۔

سورة یس حاشیہ نمبر 55

یہ حکم ان ہیکڑے مجرموں کے معاملہ میں دیا جائے گا جو اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کریں گے، گواہیوں کو بھی جھٹلا دیں گے، اور نامہ اعمال کی صحت بھی تسلیم نہ کریں گے۔ تب اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ اچھا، اپنی سکو اس بند کرو اور دیکھو کہ تمہارے اپنے اعضاۓ بدن تمہارے کرتوں کی کیا روداد سناتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں صرف ہاتھوں اور پاؤں کی شہادت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ مگر دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں، ان کے کان، ان کی زبانیں اور ان کے جسم کی کھالیں بھی پوری داستان سنادیں گی کہ وہ

ان سے کیا کام لیتے رہے ہیں۔ **يَوْمَ تَشَهُّدُ عَلَيْهِمُ الْسِنَّةُ هُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ** ﴿٢٤﴾ (النور۔ آیت 24)۔ **حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهَدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَ
جُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ** ﴿٢٥﴾ (حُمُم السجدة۔ آیت 20)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کے منہ بند کر دیں گے، اور دوسری طرف سورۃ نور کی آیت میں فرماتا ہے کہ ان کی زبان میں گواہی دیں گی، ان دونوں باتوں میں تطابق کیسے ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منہ بند کر دینے سے مراد ان کا اختیار کلام سلب کر لینا ہے، یعنی اس کے بعد وہ اپنی زبان سے اپنی مرضی کے مطابق بات نہ کر سکیں گے۔ اور زبانوں کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ ان کی زبان میں خود یہ داستان سنانا شروع کر دیں گی کہ ہم سے ان ظالموں نے کیا کام لیا تھا، کیسے کیسے کفر بکے تھے، کیا کیا جھوٹ بولے تھے، کیا کیا فتنے برپا کیے تھے، اور کس کس موقع پر انہوں نے ہمارے ذریعہ سے کیا باتیں کی تھیں۔

سورة حُمُم السجدة حاشیہ نمبر 25:

احادیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ جب کوئی ہیکڑا مجرم اپنے جرائم کا انکار ہی کرتا چلا جائے گا اور تمام شہادتوں کو بھی جھٹلانے پر تُل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے جسم کے اعضاء ایک ایک کر کے شہادت دیں گے کہ اس نے ان سے کیا کیا کام لیے تھے۔ یہ مضمون حضرت انسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعرؓ، حضرت ابو سعید خدرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے اور مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، بزار وغیرہ محدثین نے ان روایات کو نقل کیا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، لیں، حاشیہ 55)۔

یہ آیت مجملہ ان بہت سی آیات کے ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالم آخرت محض ایک روحانی عالم نہیں ہو گا بلکہ انسان وہاں دوبارہ اسی طرح جسم و روح کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ اب اس

دنیا میں ہیں۔ یہی نہیں، ان کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں۔ وہی تمام اجزاء اور جواہر (Atoms) جن سے ان کے بدن اس دنیا میں مرکب تھے، قیامت کے روز جمع کر دی جائیں گے اور وہ اپنے انہی سابق جسموں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جن کے اندر رہ کرو وہ دنیا میں کام کر چکے تھے ظاہر ہے کہ انسان کے اعضاء وہاں اسی صورت میں تو گواہی دے سکتے ہیں جبکہ وہ وہی اعضاء ہوں جن سے اس نے اپنی پہلی زندگی میں کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس مضمون پر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات بھی دلیل قاطع ہیں: بنی اسرائیل، آیات 49 تا 51۔ ۹۸۔ المومنون، ۳۵ تا ۳۸۔ ۸۳۸۲۔ النور، ۲۴۔ السجدہ، ۱۰۔ لیس، ۶۵۔ ۷۸۔ ۷۹۔ الصافات، ۱۶ تا ۱۸۔ الواقعہ، ۴۷ تا ۵۰۔ النازعات، ۱۰ تا ۱۴۔

سورة المنور حاشیہ نمبر: 22 ▲

اس آیت میں ایک اصولی بات سمجھائی گئی ہے کہ خبیثوں کا جوڑ خبیثوں ہی سے لگتا ہے، اور پاکیزہ لوگ پاکیزہ لوگوں ہی سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ ایک بد کار آدمی صرف ایک ہی برائی نہیں کیا کرتا ہے کہ اور تو سب خبیثوں سے وہ بالکل ٹھیک ہو مگر بس ایک برائی میں مبتلا ہو۔ اس کے تو اطوار، عادات، خصائص ہر چیز میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں جو اس کی ایک بڑی برائی کو سہارا دیتی اور پرورش کرتی ہیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی میں یکاکی کوئی ایک برائی کسی از غیبی گولے کی طرح پھٹ پڑے جس کی کوئی علامت اس کے چال چلن میں اور اس کے رنگ ڈھنگ میں نہ پائی جاتی ہو، یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا تم ہر وقت انسانی زندگیوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ اب کس طرح تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ایک پاکیزہ انسان جس کی ساری زندگی سے تم واقف ہو، کسی ایسی عورت سے نباہ کر لے اور برسوں نہایت محبت کے ساتھ نباہ کیے چلا جاتا رہے جو زنا کار ہو۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو بد کار بھی ہو اور پھر اس کی رفتار، گفتار، انداز، اطوار، کسی چیز سے بھی اس کے برے لچھن ظاہرنہ ہوتے ہوں؟ یا ایک شخص پاکیزہ نفس اور بلند اخلاق بھی ہو اور پھر ایسی عورت سے خوش بھی رہے جس کے یہ لچھن

ہوں؟ یہ بات یہاں اس لیے سمجھائی جا رہی ہے کہ آئندہ اگر کسی پر کوئی الزام لگایا جائے تو لوگ اندھوں کی طرح اسے بس سنتے ہی نہ مان لیا کریں بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ کس پر الزام لگایا جا رہا ہے، کیا الزام لگایا جا رہا ہے، اور وہ کسی طرح وہاں چسپاں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ بات لگتی ہوئی ہو تو آدمی ایک حد تک اسے مان سکتا ہے، یا کم از کم ممکن اور متوقع سمجھ سکتا ہے۔ مگر ایک انوکھی بات جس کی صداقت کی تائید کرنے والے آثار کہیں نہ پائے جاتے ہوں صرف اس لیے کیسے مان لی جائے کہ کسی احمق یا خبیث نے اسے منه سے خارج کر دیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ بری باتیں بڑے لوگوں کے لیے ہیں (یعنی وہ ان کے مستحق ہیں) اور بھلی باتیں بھلے لوگوں کے لیے ہیں اور بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ باتیں ان پر چسپاں ہوں جو بدگو اشخاص ان کے بارے میں کہتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بڑے اعمال بڑے ہی لوگوں سختے ہیں اور نیک اعمال نیک ہی لوگوں کو سزاوار ہیں نیک لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ بڑے اعمال ان پر چسپاں ہوں جو منسوب کرنے والے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں کچھ اور لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بری باتیں بڑے ہی لوگوں کے کرنی کی ہیں اور بھلے لوگ بھلی باتیں ہی کیا کرتے ہیں۔ بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ اس طرح کی باتیں کریں جیسی یہ افتر اپرداز لوگ کر رہے ہیں۔ آیت کے الفاظ میں ان سب تفسیروں کی گنجائش ہے۔ لیکن ان الفاظ کو پڑھ کر پہلا مفہوم جو ذہن میں آتا ہے وہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے بھی جو معنویت اس میں ہے وہ ان دوسرے مفہومات میں نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوهُ وَتُسْلِمُوا عَلَىٰ
أَهْلِهَا طَبِيعَتُكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾ فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا
تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ أَرْجِعُوهَا فَارْجِعُوهَا إِذْنُكُمْ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيهِمْ ﴿٢٥﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا
مَتَاءٌ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبَدِّلُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿٢٦﴾ قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغْضُبُوا مِنْ
أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْلَى لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَيْرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿٢٧﴾ وَقُلْ
لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبَدِّلِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَلَا يَضِرُّ بْنَ بَخْرُهُنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبَدِّلِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا بِعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبَاءِهِنَّ
أَوْ أَبَاءِ بُعْولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعْولَتِهِنَّ أَوْ إِخْرَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْرَانِهِنَّ أَوْ بَنِي
آخَوَتِهِنَّ أَوْ نِسَاءِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التِّبِيعُونَ غَيْرِ أُولِي الْأَرْبَةِ مِنَ
الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهِرُوا عَلَى عَوْرَتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضِرُّ بْنَ بَارِجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ
مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِينَتِهِنَّ طَوْبَوْا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيْهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٨﴾
وَأَنْكِحُوا الْأَيَامِيْ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَاءِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءً يُغْنِيْهِمْ

اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ طَ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٢﴾ وَلَيْسَتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمْ
 اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ طَ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَا تِبْوُهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ
 فِيهِمْ خَيْرًا طَ وَأَتُوْهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي أَتَكُمْ طَ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَبَيِّنُكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ
 أَرَدْنَ تَحْصُنَا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا طَ وَمَنْ يُكْرِهُهُنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ
 إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَتِ مُّبَيِّنَاتٍ طَ وَمَثَلًا مِنَ الَّذِينَ
 خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ طَ

۲ کو ۶ ر

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرا گھر میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضانہ لے لو ²³ اور گھر والوں پر سلام نہ بھجو، یہ طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ ²⁴ پھر اگر وہاں کسی کونہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی جائے، ²⁵ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ، یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، ²⁶ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ البتہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے ﴿یا کام﴾ کی کوئی چیز ہو، ²⁷ تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو سب کی اللہ کو خبر ہے۔

اے نبی ﷺ، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں ²⁸ اور اپنی شر مگاہوں کی حفاظت کریں، ²⁹ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔

اور اے نبی ﷺ، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، ³⁰ اور اپنی شر مگاہوں کی حفاظت کریں، ³¹ اور ³² اپنا بناو سنگھارنا دکھائیں ³³ بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے، ³⁴ اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ ³⁵ وہ اپنا بناو سنگھارنا ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: ³⁶ شوہر، باپ، شوہروں کے باپ ³⁷، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے ³⁸، بھائی ³⁹، بھائیوں کے بیٹے ⁴⁰، بہنوں کے بیٹے ⁴¹، اپنے میل جوں کی عورتیں ⁴²، اپنے مملوک ⁴³، وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں ⁴⁴، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔

وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوتی نہ چلا کریں کہ اپنی جوزینت انہوں نے چھپا رکھی ہوا سکالوگوں کو علم 46 ہو جائے۔ 47

اے مومنو، تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو 48، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ 49

تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں 50، اور تمہارے لوندی غلاموں میں سے جو صالح ہوں 51، ان کے نکاح کر دو۔ 52 اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے گا 53، اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انھیں چاہیے کہ عِفت مابی اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے۔ 54 اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں 55 ان سے مکاتبت کرو 56 اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے 57، اور ان کو اُس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ 58 اور اپنی لوندیوں کو اپنے دُنیوی فائدوں کی خاطر تجھے گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاکدا من رہنا چاہتی ہوں 59، اور جو کوئی اُن کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ اُن کے لیے غفور و رحیم ہے۔

ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمہارے پاس بھیج دی ہیں، اور ان قوموں کی عبرتناک مثالیں بھی ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گز ری ہیں، اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں۔ 60

سورة النور حاشیہ نمبر: 23 ▲

سورہ کے آغاز میں جو احکام دیے گئے تھے وہ اس لیے تھے کہ معاشرے میں برائی رونما ہو جائے تو اس کا تدارک کیسے کیا جائے۔ اب وہ احکام دیے جا رہے ہیں جن کو مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے برائیوں کی پیدائش ہی کو روک دیا جائے اور تمدن کے طور طریقوں کی اصلاح کر کے ان اسباب کا سد باب کر دیا جائے جن سے اس طرح کی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان احکام کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیں :

اول یہ کہ واقعہ افک پر تبصرہ کرنے کے معاً بعد یہ احکام بیان کرنا صاف طور پر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تشخیص میں زوجہ رسول جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نفوذ کر جانا دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شہوانی ماحول کو بدل دینے کی کوئی صورت اس کے سوانہ تھی کہ لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف آنا جانا بند کیا جائے، اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی دید سے اور آزادانہ میل جوں سے روکا جائے، عورتوں کو ایک قریبی حلقے کے سوا غیر محرم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے، تجہب گری کے پیشے کا قطعی انسداد کیا جائے، مردوں اور عورتوں کو زیادہ دیر تک مجرد نہ رہنے دیا جائے، اور لوندی غلاموں تک کے تجرد کا مداوا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عورتوں کی بے پردگی، اور معاشرے میں بکثرت لوگوں کا مجرد رہنا، اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بنیادی اسباب ہیں جن سے اجتماعی ماحول میں ایک غیر محسوس شہوانیت ہر وقت ساری وجاری رہتی ہے اور اسی شہوانیت کی بدولت لوگوں کی آنکھیں، ان کے کان، ان کی زبانیں، ان کے دل، سب کے سب کسی واقعی یا خیالی فتنے (Scandal) میں پڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت

میں ان احکام سے زیادہ صحیح و مناسب اور موثر کوئی دوسری تدبیر نہ تھی، ورنہ وہ ان کے سوا کچھ دوسرے احکام دیتا۔

دوسری بات جو اس موقع پر سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ شریعت الہی کسی برائی کو محض حرام کر دینے، یا اسے جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ وہ ان اسباب کا بھی خاتمه کر دینے کی فکر کرتی ہے جو کسی شخص کو اس برائی میں مبتلا ہونے پر اکساتے ہوں، یا اس کے لیے موقع بھم پہنچاتے ہوں، یا اس پر مجبور کر دیتے ہوں۔ نیز شریعت جرم کے ساتھ اسباب جرم، محرکات جرم اور رسائل و ذرائع جرم پر بھی پابندیاں لگاتی ہے، تاکہ آدمی کو اصل جرم کی عین سرحد پر پہنچنے سے پہلے کافی فاصلے ہی پر روک دیا جائے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی کہ لوگ ہر وقت جرم کی سرحدوں پر ٹھلتے رہیں اور روز کپڑے جائیں اور سزا نہیں پایا کریں۔ وہ صرف محتسب (Prosecutor) ہی نہیں ہے بلکہ ہمدرد، مصلح اور مددگار بھی ہے، اس لیے وہ تمام تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اس غرض کے لیے استعمال کرتی ہے کہ لوگوں کو برائیوں سے بچنے میں مدد دی جائے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 24

اصل میں لفظ **حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا** استعمال ہوا ہے، جس کو عموماً لوگوں نے **حَتَّىٰ تَسْتَأْذِنُوا** کے معنی میں لے لیا ہے، لیکن درحقیقت دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے جس کو نظر اندازنا کرنا چاہیے۔ اگر **حَتَّىٰ تَسْتَأْذِنُوا** فرمایا جاتا تو آیت کے معنی یہ ہوتے کہ "لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو" اس طرز تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے **حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا** کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ استیناس کا مادہ انس ہے جو اردو زبان میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادے سے استیناس کا لفظ جب بولیں گے تو اس کے معنی ہوں گے انس معلوم کرنا، یا اپنے سے

مانوس کرنا۔ پس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ "لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ ان کو مانوس نہ کر لو یا ان کا انس معلوم نہ کر لو"، یعنی یہ معلوم نہ کر لو کہ تمہارا آنا صاحب خانہ کونا گوار تو نہیں ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ "اجازت لینے" کے بجائے "رضالینے" کے الفاظ سے کیا ہے کیونکہ یہ مفہوم اصل سے قریب تر ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 25 ▲

جاہلیت میں اہل عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حییتم صبایحاً، حییتم مسائے (صحب خیر، شام خیر) کہتے ہوئے بے تکلف ایک دوسرے کے گھر میں گھس جاتے تھے اور بسا اوقات گھروں پر اور ان کی عورتوں پر نادیدنی حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تخلیے کا حق حاصل ہے اور کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے تخلیے میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر خل انداز ہو۔ اس حکم کے نازل ہونے پر نبی ﷺ نے معاشرے میں جو آداب اور قواعد جاری فرمائے انہیں ہم ذیل میں نمبر وار بیان کرتے ہیں:

(۱) حضور ﷺ نے تخلیے کے اس حق کو صرف گھروں میں داخل ہونے کے سوال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حق قرار دیا جس کی رو سے دوسرے کے گھر میں جھانکنا، باہر سے نگاہ ڈالنا، حتیٰ کہ دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ حضرت ثوبان (نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "اذا دخل البصر فلا اذن" جب نگاہ داخل ہو گئی تو پھر خود داخل ہونے کے لیے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا" (ابوداؤد)۔ حضرت ہریل بن شرحبیل کہتے ہیں ایک شخص نبی ﷺ کے ہاں حاضر ہوا اور عین دروازے پر کھڑا ہوا کراجزت مانگنے لگا۔ حضور ﷺ نے اسے فرمایا "کذاعنك، فانما لا ستیزان من النظر" پرے ہٹ کر کھڑے ہو، اجازت مانگنے کا حکم تو اسی لیے ہے کہ نگاہ نہ پڑے" (ابوداؤد)۔ حضور ﷺ کا اپنا قاعدہ یہ تھا کہ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے عین سامنے

کھڑے نہ ہوتے، کیونکہ اس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر پردے نہ لٹکائے جاتے تھے۔ آپ ﷺ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اجازت طلب فرمایا کرتے تھے (ابوداؤد)۔ حضرت انس خادم رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے حجرے میں باہر سے جہان کا۔ حضور ﷺ اس وقت ایک تیر ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ اس کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کہ اس کے پیٹ میں بھونک دیں گے (ابوداؤد)۔ حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا من نظری کتاب اخیہ بغيراذنه فانيا ينظري النار جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر دوڑائی وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے" (ابوداؤد)۔ صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا لو ان امرأ اطلع عليك بغير اذن فخذ فتة مصاصة ففقات عليه ما كان عليك من جناح اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو کچھ گناہ نہیں"۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں ہے من اطلع دار قوم بغير اذنهم ففقوء اعينه فقد هدرت عينه جس نے کسی کے گھر میں جہان کا اور گھر والوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کچھ موآخذہ نہیں"۔ امام شافعیؒ نے اس ارشاد کو بالکل لفظی معنوں میں لیا ہے اور وہ جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ لیکن حنفیہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ حکم محض نگاہ ڈالنے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص گھر میں بلا اجازت گھس آئے اور گھر والوں کے روکنے پر وہ بازنہ آئے اور گھر والے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کشمکش اور مزاحمت میں اس کی آنکھ پھوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو گھر والوں پر کوئی موآخذہ نہ ہو گا (احکام القرآن جصاص۔ ج 3۔ ص 385)۔

(۲) فقهاء نے نگاہ ہی کے حکم میں ساعت کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً اندھا آدمی اگر بلا اجازت آئے تو اس کی نگاہ نہ پڑے گی، مگر اس کے کان تو گھر والوں کی باتیں بلا اجازت سنیں گے۔ یہ چیز بھی نظر ہی کی طرح تخلیہ کے حق میں بے جامد اخلت ہے۔

(۳) اجازت لینے کا حکم صرف دوسروں کے گھر جانے کی صورت ہی میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی ماں بہنوں کے پاس جانے کی صورت میں بھی ہے۔ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا میرے سوا ان کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے، کیا ہر بار جب میں اس کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں؟ فرمایا اتحب ان تراها عربیانہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟" (ابن جریر عن عطاء بن یسار مرسلًا)۔ عبد اللہ بن مسعود کا قول ہے علیکم ان تستاذنوا علی امہاتکم و اخواتکم، اپنی ماں بہنوں کے پاس بھی جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ (ابن کثیر) بلکہ ابن مسعود تو کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس جاتے ہوئے بھی آدمی کو کم از کم کھنکار دینا چاہیے۔ ان کی بیوی زینب کی روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود جب کبھی گھر میں آنے لگتے تو پہلے کوئی ایسی آواز کر دیتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ آرہے ہیں۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ اچانک گھر میں آن کھڑے ہوں (ابن جریر)۔

(۴) اجازت طلب کرنے کے حکم سے صرف یہ صورت مستثنی ہے کہ کسی کے گھر پر اچانک کوئی مصیبت آجائے، مثلاً آگ لگ جائے یا چور گھس آئے۔ ایسے موقع پر مدد کے لیے بلا اجازت جاسکتے ہیں۔

(۵) اول اول جب استیزان کا قاعدہ مقرر کیا گیا تو لوگ اس کے آداب سے واقف نہ تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نبی ﷺ کے ہاں آیا اور دروازے پر سے پکار کر کہنے لگا **آل ج** (کیا میں گھر میں گھس آؤں؟) نبی ﷺ نے اپنی لونڈی روپسہ سے فرمایا یہ شخص اجازت مانگنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ ذرا اٹھ کر اسے بتا کہ یوں کہنا

چاہیے السلام علیکم اُدخل (ابن حیرر۔ ابو داؤد)۔ جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے مرحوم والد کے قرضوں کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹ کھٹایا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا "میں ہوں"۔ آپ ﷺ نے دو تین مرتبہ فرمایا: "میں ہوں؟ میں ہوں؟" یعنی اس میں ہوں سے کوئی کیا سمجھے کہ تم کون ہو (ابو داؤد)۔ ایک صاحب کلدہ بن حنبل ایک کام سے نبی ﷺ کے ہاں گئے اور سلام کے بغیر یوں ہی جا بیٹھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا باہر جاؤ، اور السلام علیکم کہہ کر اندر آؤ (ابو داؤد)۔ استیزان کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آدمی اپنا نام بتا کر اجازت طلب کرے۔ حضرت عمر کے متعلق روایت ہے کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے "السلام علیہ یا رسول اللہ ، ایدخل عمر (ابو داؤد)۔ اجازت لینے کے لیے حضور ﷺ نے زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پکارنے کی حد مقرر کر دی اور فرمایا اگر تیسرا مرتبہ پکارنے پر بھی جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ (بخاری، مسلم، ابو داؤد)۔ یہی حضور ﷺ کا اپنا طریقہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ کے ہاں گئے اور "اسلام علیکم و رحمۃ اللہ" کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی، مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسرا مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپ ﷺ واپس ہو گئے۔ حضرت سعد اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ میں آپ ﷺ کی آواز سن رہا تھا، مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے میرے لیے جتنی بار بھی سلام و رحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے، اس لیے میں بہت آہستہ آہستہ جواب دیتا رہا (ابو داؤد۔ احمد)۔ یہ تین مرتبہ پکارنا پے در پے نہ ہونا چاہیے، بلکہ ذرا ٹھہر ٹھہر کر پکارنا چاہیے تاکہ صاحب خانہ کو اگر کوئی مشغولیت جواب دینے میں مانع ہو تو اسے فارغ ہونے کا موقع مل جائے۔

(۶) اجازت یا تو خود صاحب خانہ کی معتبر ہے یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ صاحب خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے، مثلاً گھر کا خادم یا کوئی اور ذمہ دار قسم کا فرد۔ کوئی چھوٹا سا بچہ کہہ دے کہ آجاؤ تو اس پر اعتماد کر کے داخل نہ ہو جانا چاہیے۔

(۷) اجازت طلب کرنے میں بے جا اصرار کرنا، یا اجازت نہ ملنے کی صورت میں دروازے پر جم کر کھڑے ہو جانا جائز نہیں ہے۔ اگر تین دفعہ استیزان کے بعد صاحب خانہ کی طرف سے اجازت نہ ملے، یا وہ ملنے سے انکار کر دے تو واپس چلے جانا چاہیے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 26 ▲

یعنی کسی کے خالی گھر میں داخل ہو جانا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ صاحب خانہ نے آدمی کو خود اس بات کی اجازت دی ہو۔ مثلاً اس نے آپ سے کہہ دیا ہو کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو آپ میرے کمرے میں بیٹھ جائیے گا، یا وہ کسی اور جگہ پر ہو اور آپ کی اطلاع ملنے پر وہ کھلا بھیجے کہ آپ تشریف رکھیے، میں ابھی آتا ہوں۔ ورنہ محض یہ بات کہ مکان میں کوئی نہیں ہے، یا اندر سے کوئی نہیں بولتا، کسی کے لیے یہ جائز نہیں کر دیتی کہ وہ بلا اجازت داخل ہو جائے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 27 ▲

یعنی اس پر برانہ ماننا چاہیے۔ ایک آدمی کو حق ہے کہ وہ کسی سے نہ ملنا چاہے تو انکار کر دے، یا کوئی مشغولیت ملاقات میں مانع ہو تو معدرت کر دے۔ **إِذْ جِعْوَا** (واپس ہو جاؤ) کے حکم کا فقہاء نے یہ مطلب لیا ہے کہ اس صورت میں دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کی اجازت نہیں ہے بلکہ آدمی کو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ملاقات پر مجبور کرے، یا اس کے دروازے پر ٹھر کر اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 28 ▲

اس سے مراد ہیں ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دوکانیں، مسافرخانے وغیرہ جہاں لوگوں کے لیے داخلہ کی اجازت ہو۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 29 ▲

اس میں الفاظ ہیں **يَغْضُوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ - غَضٌّ** کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کرنے، گھٹانے اور پست کرنے کے۔ **غَضٌّ** بصر کا ترجمہ عام طور پر نگاہ پھی کرنا یا رکھنا کیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس حکم کا مطلب ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ پوری طرح نگاہ بھر کرنے دیکھنا، اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزادانہ چھوڑ دینا ہے۔ یہ مفہوم "نظر بچانے" سے ٹھیک ادا ہوتا ہے، یعنی جس چیز کو دیکھنا مناسب نہ ہو اس سے نظر ہٹالی جائے، قطع نظر اس سے کہ آدمی نگاہ پھی کرے یا کسی اور طرف اسے بچالے جائے۔ **مِنْ أَبْصَارِهِمْ** میں **مِنْ** تبعیض کے لیے ہے، یعنی حکم تمام نظروں کو بچانے کا نہیں ہے بلکہ بعض نظروں کو بچانے کا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کا منشاء نہیں ہے کہ کسی چیز کو بھی نگاہ بھر کرنے دیکھا جائے، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص دائرے میں نگاہ پر یہ پابندی عائد کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ بات سیاق و سبق سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ پابندی جس چیز پر عائد کی گئی ہے وہ چاہے مردوں کا عورتوں کو دیکھنا، یا دوسراے لوگوں کے ستر پر نگاہ ڈالنا، یا فخش مناظر پر نگاہ جانا۔

کتاب اللہ کے اس حکم کی جو تشریح سنت نے کی ہے اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

(۱) آدمی کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے۔ ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے، لیکن یہ معاف نہیں ہے کہ آدمی نے پہلی نظر میں جہاں کوئی کشش محسوس کی ہو وہاں پھر نظر دوڑائے۔ نبی ﷺ نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ

کی بد کاری سے تعبیر فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے تمام حواس سے زنا کرتا ہے۔ دیکھنا آنکھوں کی زنا ہے۔ لگاؤٹ کی بات چیت زبان کی زنا ہے۔ آواز سے لذت لینا کانوں کی زنا ہے۔ ہاتھ لگانا اور ناجائز مقصد کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کی زنا ہے۔ بد کاری کی یہ ساری تمہید میں جب پوری ہو چکتی ہیں تو شرم گاہیں یا تو اس کی تکمیل کر دیتی ہیں، یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں (بخاری، مسلم، ابو داؤد)۔ حضرت بُرَيْدَةؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: يَا عَلِيٌّ لَا تَتَبَعِ النَّظَرَةَ فَإِنَّكَ الْأَوَّلُ وَلَيْسَ لَكَ الْآخِرَةَ اَعْلَى! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔ پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری معاف نہیں" (احمد، ترمذی، ابو داؤد، دارمی)۔ حضرت جریر بن عبد اللہ بجگی کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں۔ فرمایا فوراً نگاہ پھیر لو، یا نیچی کر لو (مسلم، احمد، ترمذی، ابو داؤد، نسائی)۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان النظر سهم من سهام ابليس مسموم، من تركها مخافتی ابدلته ايماي جد حلاوتة في قلبه نگاہ ابليس کے زہر لیے تیروں میں سے ایک تیر ہے، جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا میں اس کے بد لے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا (طبرانی)۔ ابو امامہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مامن مسلم ينظر الى محسن امرأة ثم يغض بصره الا اختلف الله له عبادة يجد حلاوتها جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹا لے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے" (مسند احمد)۔ امام جعفر صادق اپنے والد امام محمد باقر سے اور وہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ کے چپازاد بھائی فضل بن عباس (جو اس وقت ایک نوجوان لڑ کے تھے) مشعر حرام سے واپسی کے وقت حضور ﷺ کے ساتھ اوٹ پر سوار تھے۔ راستے سے جب عورتیں گزرنے لگیں تو فضل ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نبی ﷺ نے ان کے منه پر ہاتھ رکھا اور اسے

دوسری طرف پھیر دیا (ابوداؤد)۔ اسی ججۃ الوداع کا قصہ ہے کہ قبیلہ خشم کی ایک عورت راستہ میں حضور ﷺ کو روک کر حج کے متعلق ایک مسئلہ پوچھنے لگی اور فضل بن عباس نے اس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ نبی ﷺ نے ان کامنہ پکڑ کر دوسری طرف کر دیا۔ (بخاری، ابو داؤد، ترمذی)۔

(۲) اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی تبھی تو غرض بصر کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر چہرے کا پردہ رانج کیا جا چکا ہوتا تو پھر نظر بچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال۔ یہ استدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعہ کے اعتبار سے بھی۔ عقلی حیثیت سے یہ اس لیے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رانج ہو جانے کے باوجود ایسے موقع پیش آسکتے ہیں جبکہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے۔ اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے۔ اور مسلمان عورتوں میں پردہ رانج ہونے کے باوجود بہر حال غیر مسلم عورتیں توبے پردہ ہی رہیں گی۔ لہذا مخف غرض بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مستلزم ہے۔ اور واقعہ کے اعتبار سے یہ اس لیے غلط ہے کہ سورہ احزاب میں احکام حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رانج کیا گیا تھا اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا اور نبی ﷺ کے عہد مبارک میں اس کا رانج ہونا بکثرت روایات سے ثابت ہے۔ واقعہ افک کے متعلق حضرت عائشہؓ کا بیان جو نہایت معتبر سندوں سے مروی ہے اس میں وہ فرماتی ہیں کہ جنگل سے واپس آ کر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی۔ صبح کو صفوان بن مُعطل وہاں سے گزر ا تو دور سے کسی کو پڑے دیکھ کر ادھر آگیا۔ فعرفنی حین رانی و کان قد رانی قبل الحجاب فاستیقظت باسترجاعه حین عرفنی فخرت وجہی بجلبی وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ مجھے پہچان کر جب اس نے انا اللہ و انا الیہ راجعون پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے منہ

ڈھانک لیا۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابن جریر، سیرت ابن ہشام) ابو داؤد، کتاب الجہاد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک خاتون اُم خلداد کا لڑکا ایک جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق دریافت کرنے کے لیے بنی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلَہٖ وَسَلَّمَ کے پاس آئیں، مگر اس حال میں بھی چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بعض صحابہؓ نے حیرت کے ساتھ کہا کہ اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے؟ یعنی بیٹی کی شہادت کی خبر سن کر تو ایک ماں کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اور تم اس اطمینان کے ساتھ باپرده آئی ہو۔ جواب میں کہنے لگیں ان ارزاً ابْنی فَلَنْ ارزاً حیائی میں نے بیٹا تو ضرور کھویا ہے مگر اپنی حیات تو نہیں کھودی۔" ابو داؤدؓ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت نے پردے کے پچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلَہٖ وَسَلَّمَ کو درخواست دی۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلَہٖ وَسَلَّمَ نے پوچھا یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اس نے عرض کیا عورت ہی کا ہے۔ فرمایا "عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن، ہی مہندی سے رنگ لیے ہوتے۔" رہے حج کے موقع کے وہ دو واقعات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے تو وہ عہدِ نبوی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلَہٖ وَسَلَّمَ میں چہرے کا پردا نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے، کیونکہ احرام کے لباس میں نقاب کا استعمال ممنوع ہے۔ تاہم اس حالت میں بھی محتاط خواتین غیر مردوں کے سامنے چہرہ کھول دینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالت احرام مکہ کی طرف جا رہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتیں، اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں" (ابو داؤد، باب فی المحرمة تَعَظِّلُ وَ جَهَّا).

(۳) غضّ بصر کے اس حکم سے مستثنی صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو۔ اس غرض کے لیے عورت کو دیکھ لینے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ ایسا کرنا کم از کم مستحب تو ضرور ہے۔ مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے کہ میں نے ایک جگہ نکاح کا پیغام دیا۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلَہٖ وَسَلَّمَ نے پوچھا تم نے لڑکی کو دیکھ بھی لیا ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں۔

فرمایا انظر الیہا فانہ احری ان یُعِدِ مبین کیا اسے دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ تمہارے درمیان موافق ہو گی" (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)۔ ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کہیں شادی کا پیغام دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا انظر الیہا فان فی اعین الانصار شیئاً لڑکی کو دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہوتی ہے" (مسلم، نسائی، احمد)۔ جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا اذا خطب احد کم المرأة فَقَدْ رَأَى مِنْهَا بَعْضًا مَا يَدْعُوهَا إِلَى نَكاحٍ هَا فَلَيَفْعُلْ تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا خواستگار ہو تو حتی الامکان اسے دیکھ کر یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا عورت میں ایسی کوئی خوبی ہے جو اس کے ساتھ نکاح کی طرف راغب کرنے والی ہو" (احمد، ابو داؤد)۔ مسنند احمد میں ابو حمیدہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اس غرض کے لیے دیکھنے کی اجازت کو فلا جناح علیہ کے الفاظ میں بیان کیا، یعنی ایسا کر لینے میں مضائقہ نہیں ہے۔ نیز اس کی بھی اجازت دی کہ لڑکی کی بے خبری میں بھی اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی سے فقهاء نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ بضرورت دیکھنے کی دوسری صورتیں بھی جائز ہیں۔ مثلاً تفتیش جرائم کے سلسلے میں کسی مشتبہ عورت کو دیکھنا، یا عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کا کسی گواہ عورت کو دیکھنا، یا علاج کے لیے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا وغیرہ۔

(۲) غض بصر کے حکم کا مشایہ بھی ہے کہ آدمی کسی عورت یا مرد کے ستر پر نگاہ نہ ڈالے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہ لا ینظر الرجل إلی عورۃ الرجُل ولا تنظر المرأة إلی عورۃ المرأة کوئی مرد کسی مرد کے ستر کونہ دیکھے، اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کونہ دیکھے" (احمد، مسلم، ابو داؤد، ترمذی)۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا لا تنظر إلی فخذ حی ولا میت کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران پر نگاہ نہ ڈالو" (ابوداؤد، ابن ماجہ)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 30 ▲

شر مگاہوں کی حفاظت سے مراد محض ناجائز شہوت رانی سے پرہیز ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے سے پرہیز بھی ہے۔ مرد کے لیے ستر کے حدود نبی ﷺ نے ناف سے گھٹنے تک مقرر فرمائے ہیں عورۃ الرجل ما بین سرتہ الی رکبته مرد کا ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے" (دارقطنی بیہقی)۔ اس حصہ جسم کو بیوی کے سوا کسی کے سامنے قصد آکھولنا حرام ہے۔ حضرت جرہد اسلمی، جو اصحاب صفة میں سے ایک بزرگ تھے، روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ایک دفعہ میری ران کھلی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اما علیت ان الفخذ عورۃ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ران چھپانے کے قابل چیز ہے؟" (ترمذی، ابو داؤد، مؤطرا)۔ حضرت علی کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا لا تُبِرِّزْ (یا لا تکشف) فخذک اپنی ران کبھی نہ کھلو۔" (ابو داؤد، ابن ماجہ)۔ صرف دوسروں کے سامنے ہی نہیں، تنہائی میں بھی نگارہنا منوع ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ایا کم ولا تعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط و حين یفضی الرجل الی اهله فاستحیوهم و اکرموهم خبردار کبھی نگے نہ رہو کیونکہ تمہارے ساتھ وہ ہیں جو کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے (یعنی خیر اور رحمت کے فرشتے) سوائے اس وقات کے جب تم رفع حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو، لہذا ان سے شرم کرو اور ان کا احترام محفوظ رکھو" (ترمذی)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا احفظ عورتك الا من زوجتك او ما مملكت ییینک اپنے ستر کو اپنی بیوی اور لوئندی کے سوا ہر ایک سے محفوظ رکھو"۔ سائل نے پوچھا اور جب ہم تنہائی میں ہوں؟ فرمایا فالله تبارک و تعالیٰ احق ان یستحیا منہ تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم کی جائے،" (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 31 ▲

عورتوں کے لئے بھی غض بصر کے احکام وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں، یعنی انہیں قصد اغیر مردوں کو نہ دیکھنا چاہئے، نگاہ پڑ جائے تو ہٹا لینی چاہیے، اور دوسروں کے ستر کو دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن مرد کے عورت کو دیکھنے کی بہ نسبت عورت کو مرد کو دیکھنے کے معاملہ میں احکام تھوڑے سے مختلف ہیں۔ ایک طرف حدیث میں ہم کو یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہؓ نبی ﷺ کے پاس بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابن امّ مکتوم آگئے، نبی ﷺ نے دونوں بیویوں سے فرمایا احتجا منہ ان سے پردہ کرو، بیویوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ الیس اعمی لا یصنا ولا یعرفنا، یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے، فرمایا: افعیا و ان انتبا، الاستبات بصرا انه، کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انہیں دیکھتیں؟ حضرت ام سلمہ تصریح کرتی ہیں کہ ذلك بعد ان امر بالجاب، یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پردے کا حکم آچکا تھا۔ (احمد ابو داؤد، ترمذی) اور اس کی تائید موطاکی یہ روایت کرتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک نابینا آیا تو انہوں نے اس سے پردہ کیا، کہا گیا کہ آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں؟ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔ جواب میں ام المؤمنین نے فرمایا: لکنی انظر الیہ، میں تو اسے دیکھتی ہوں۔

دوسری طرف ہمیں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ملتی ہے کہ ہجری میں جوشیوں کا وفد مدینے آیا اور اس نے مسجد نبوی کے احاطے میں ایک تماشا کیا نبی ﷺ نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا۔ (بخاری، مسلم، احمد) تیسرا طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فاطمہ بنت قیس کو جب ان کے شوہرنے تین طلاقوں دے دیں تو سوال پیدا ہوا کہ وہ عدت کہاں گزاریں، پہلے حضور ﷺ نے فرمایا ام شریک انصاریہ کے ہاں رہو، پھر فرمایا ان کے ہاں میرے صحابہؓ بہت جاتے رہتے ہیں (کیونکہ وہ ایک بڑی مالدار اور فیاض خاتون تھیں، بکثرت لوگ ان کے ہاں مہمان رہتے اور وہ ان کی ضیافت کرتی تھیں) لہذا تم ابن ام مکتوم کے ہاں رہو، وہ اندھے آدمی

ہیں، تم ان کے ہاں بے تکلف رہ سکو گی (مسلم، ابو داؤد) ان روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے مردوں کو دیکھنے کے معاملے میں اتنی سختی نہیں ہے جتنی مردوں کے عورتوں کو دیکھنے کے معاملے میں ہے۔ ایک مجلس میں آمنے سامنے بیٹھ کر دیکھنا منوع ہے، راستہ چلتے ہوئے یادور سے کوئی جائز قسم کا کھیل تماشا دیکھتے ہوئے مردوں پر نگاہ پڑنا منوع نہیں ہے۔ اور کوئی حقیقی ضرورت پیش آجائے تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی دیکھنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ امام غزالی اور ابن حجر عسقلانی نے بھی روایات سے قریب قریب یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ شوکانی نیل الاوطار میں ابن حجر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ جوزا کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے کے معاملے میں ہمیشہ جواز ہی پر عمل رہا ہے۔ مسجدوں میں، بازاروں میں، اور سفروں میں عورتیں تو نقاب منه پر ڈال کر جاتی تھیں کہ مردان کو نہ دیکھیں، مگر مردوں کو کبھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی نقاب اوڑھیں تاکہ عورتیں ان کو نہ دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معاملے میں حکم مختلف ہے۔ (جلد ۲، صفحہ ۱۰۱) تاہم یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ عورتیں اطمینان سے مردوں کو گھوریں اور ان کے حسن سے آنکھیں سینکیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 32 ▲

یعنی ناجائز شہوت رانی سے بھی پرہیز کریں، اور اپنا ستر دونوں کے سامنے کھونے سے بھی، اس معاملے میں عورتوں کے لئے بھی وہی احکام ہیں جو مردوں کے لئے ہیں، لیکن عورت کے ستر کے حدود مردوں سے مختلف ہیں، نیز عورت کا ستر مردوں کے لئے الگ ہے اور عورتوں کے لئے الگ۔

مردوں کے لئے عورت کا ستر ہاتھ اور منه کے سوا اس کا پورا جسم ہے جسے شوہر کے سوا کسی دوسرے مرد حتیٰ کہ باپ اور بھائی کے سامنے بھی نہ کھلنا چاہئے، اور عورت کو ایسا باریک یا چست لباس بھی نہ پہنانا چاہئے جس سے بدن اندر سے جھلکے یا بدن کی ساخت نمایاں ہو۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ان کی بہن حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر رسول اللہ ﷺ کے سامنے آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔

حضور ﷺ نے فوراً منہ پھیر لیا اور فرمایا: يَا أَسْيَاءَ إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيضَ لَمْ يُصْلِحْ لَهَا إِنْ يَرْبُى مِنْهَا
 الْأَهْدَافُ هَذَا وَالشَّارِ الْوَجْهِ وَكَفِيهُ، اسْمَاءُ جَبَ عُورَتُ بَالْغَ هُوَ جَبَ تَوْجِيزٌ نَهْيٌ هُوَ كَمِنْهُ اُورَهَاتِهِ كَسَوا
 اسَ كَجَسْمٍ كَأَكْوَبِ حَصَهُ نَظَرٌ آتَيَ - (ابوداؤد) اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابن جریر نے حضرت عائشہؓ سے
 روایت کیا ہے کہ ان کے ہاں اکے اختیافی بھائی عبد اللہ بن الطفیل کی صاحبزادی آئی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ
 میں تشریف لائے تو انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ
 میری بھتیجی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: إِذَا عَرَكَتِ الْمَرْأَةُ لَمْ يَحِلْ لَهَا إِنْ تَظَهَرَ الْوَجْهُ هَا وَالْمَادُونُ هَذَا وَ
 قَبْضُ عَلَى ذِرَاعِ نَفْسِهِ وَتَرْكُ بَيْنِ قَبْضَتِهِ وَبَيْنِ الْكَفِ مُثْلِ قَبْضَةِ اخْرَى، جَبَ عُورَتُ بَالْغَ هُوَ جَبَ تَوَسُّ
 کَلَّهُ حَلَالٌ نَهْيٌ هُوَ كَوَهْ ظَاهِرٌ كَرَهَ
 نَهْيٌ خَوْدَ اپنی کلائی پر ہاتھ رکھ کر اس طرح بتائی کہ آپ ﷺ کی مٹھی اور ہھٹلی کے درمیان صرف ایک
 مٹھی کی جگہ اور باقی تھی۔ اس معاملے میں صرف اتنی رعایت ہے کہ اپنے محرم مرثتہ داروں (مثلاً باپ بھائی
 وغیرہ) کے سامنے عورت اپنے جسم کا اتنا حصہ کھول سکتی ہے جسے گھر کا کام کا ج کرتے ہوئے کھولنے کی
 ضرورت پیش آتی ہے، جیسے آٹا گوند ہستے ہوئے آستینیں اور چڑھائیں، یا گھر کا فرش دھوتے ہوئے پانچ کچھ
 اوپر کر لینا۔

اور عورت کے لئے عورت کے ستر کے حدود وہی ہیں جو مرد کے ستر کے ہیں، یعنی ناف اور
 گھٹنے کے درمیان کا حصہ، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے سامنے عورت نیم برهنہ رہے۔ بلکہ
 مطلب صرف یہ ہے کہ ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ ڈھانکنا فرض ہے اور دوسرے حصوں کا ڈھانکنا
 فرض نہیں ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 33 ▲

یہ بات نگاہ میں رہے کہ شریعت الہی عورتوں سے صرف اتنا ہی مطالبہ نہیں کرتی جو مردوں سے اس نے کیا ہے، یعنی نظر بچانا اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنا، بلکہ وہ ان سے کچھ اور مطالبے بھی کرتی ہے جو اس نے مردوں سے نہیں کیے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں عورت اور مرد یکساں نہیں ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 34 ▲

"بناو سنگھار" ہم نے "زینت" کا ترجمہ کیا ہے، جس کے لیے دوسرا الفظ آرائش بھی ہے۔ اس کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے: خوشناکپڑے، زیور، اور سر، منہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کی مختلف آرائشیں جو بالعموم عورتیں دنیا میں کرتی ہیں، جن کے لیے موجودہ زمانے میں (Make up) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ بناو سنگھار کس کونہ دکھایا جائے، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 35 ▲

اس آیت کے مفہوم کو تفسیروں کے مختلف بیانات نے اچھا خاصاً مبہم بنادیا ہے، ورنہ بجائے خود بات بالکل صاف ہے۔ پہلے فقرے میں ارشاد ہوا ہے کہ لا يُبَدِّيْنَ زِينَتَهُنَّ وہ اپنی آرائش و زیباش کو ظاہرنہ کریں۔ اور دوسرے فقرے میں الا بول کر اس حکم نہیں سے جس چیز کو مستثنی کیا گیا ہے وہ ہے ما ظَهَرَ مِنْهَا جو کچھ اس آرائش و زیباش میں سے ظاہر ہو، یا ظاہر ہو جائے۔ اس سے صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خود اس کا اظہار اور اس کی نمائش نہ کرنی چاہیے، البتہ جو آپ سے آپ ظاہر ہو جائے (جیسے چادر کا ہوا سے اڑ جانا اور کسی زینت کا کھل جانا) یا جو آپ سے آپ ظاہر ہو (جیسے وہ چادر جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے، کیونکہ بہر حال اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے، اور عورت کے جسم پر ہونے کی وجہ سے بہر حال وہ بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے) اس پر خدا کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یہی

مطلوب اس آیت کا حضرت عبد اللہ بن مسعود، حسن بصریؑ، ابن سیرین اور ابراہیم خنجری نے بیان کیا ہے۔

اس کے برعکس بعض مفسرین نے **ما ظَهَرَ مِنْهَا** کا مطلب لیا ہے : **ما يُظْهِرُهُ الْإِنْسَانُ عَلَى الْعَادَةِ الْجَارِيَةِ** (جسے عادۃً انسان ظاہر کرتا ہے)، اور پھر وہ اس میں منه اور ہاتھوں کو ان کی تمام آراء کشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ عورت اپنے منه کو مسی اور سرمے اور سرخی پاؤڈر سے، اور اپنے ہاتھوں کو انگوٹھی چھلے اور چوڑیوں اور کنگن وغیرہ سے آراستہ رکھ کر لوگوں کے سامنے کھولے پھرے۔ یہ مطلب ابن عباسؓ اور ان کے شاگردوں سے مروی ہے اور فقہاء حنفیہ کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے (احکام القرآن جصاص، جلد 3، صفحہ 388-389)۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ **ما ظَهَرَ** کے معنی **ما يُظْهِرُ** عربی زبان کے کس قاعدے سے ہو سکتے ہیں۔ "ظاہر ہونے" اور ظاہر کرنے "میں کھلا ہوا فرق ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر "ظاہر کرنے" سے روک کر "ظاہر ہونے" کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے۔ اس رخصت کو "ظاہر کرنے" کی حد تک وسیع کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور ان روایات کے بھی خلاف جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں حکم حجاب آجائے کے بعد عورتیں کھلے منه نہیں پھرتی تھیں، اور حکم حجاب میں منه کا پرده شامل تھا، اور احرام کے سوا دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جز بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ قبل تعجب بات یہ ہے کہ اس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منه اور ہاتھ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں۔ حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی ناجائز ہے۔ رہا حجاب، تو وہ ستر سے زائد ایک چیز ہے جسے عورتوں اور غیر محرم مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے، اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکام حجاب کی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 36 ▲

زمانہ جاہلیت میں عورتیں سروں پر ایک طرح کے کساوے سے باندھے رکھتی تھیں جن کی گردہ جوڑے کی طرح پیچھے چوٹی پر لگائی جاتی تھی۔ سامنے گریبان کا ایک حصہ کھلا رہتا تھا جس سے گلا اور سینے کا بالائی حصہ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ چھاتیوں پر قمیص کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ اور پیچھے دو دو تین تین چوٹیاں لہراتی رہتی تھیں (تفسیر کشاف جلد 2، صفحہ 90۔ ابن کثیر جلد 3، صفحہ 283-284)۔ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمان عورتوں میں دوپٹہ رائج کیا گیا، جس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آج کل کی صاحبزادیوں کی طرح بس اسے بل دے کر گلے کا ہار بنالیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ اسے اوڑھ کر سر، کمر، سینہ، سب اچھی طرح ڈھانک لیے جائیں۔ اہل ایمان خواتین نے قرآن کا یہ حکم سنتے ہی فوراً جس طرح اس کی تعمیل کی اس کی تعریف کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سورہ نور نازل ہوتی تو رسول اللہ ﷺ سے اس کو سن کر لوگ اپنے گھروں کی طرف پلٹے اور جا کر انہوں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں کو اس کی آیات سنائیں۔ انصار کی عورتوں میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو آیت وَلَيَضُرِّ بُنَتْ بِخُمْرٍ هِنَّ عَلَى جُمِيعِهِنَّ کے الفاظ سن کر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی ہو۔ ہر ایک اٹھی اور کسی نے اپنا کمر پٹا کھول کر اور کسی نے چادر اٹھا کر فوراً اس کا دوپٹہ بنایا اور اوڑھ لیا۔ دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت جتنی عورتیں مسجد نبوی ﷺ میں حاضر ہوئیں سب دوپٹے نے باریک کپڑے چھوڑ کر اپنے موٹے موٹے کپڑے چھانٹے اور ان کے دوپٹے بنائے (ابن کثیر، ج 3، ص 284۔ ابو داؤد، کتاب اللباس)۔

یہ بات کہ دوپٹہ باریک کپڑے کا نہ ہونا چاہیے، ان احکام کے مزاج اور مقصد پر غور کرنے سے خود ہی آدمی کی سمجھ میں آ جاتی ہے، چنانچہ انصار کی خواتین نے حکم سنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا مشاکس طرح کے کپڑے

کا دوپٹہ بنانے سے پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن صاحب شریعت ﷺ نے اس بات کو بھی صرف لوگوں کے فہم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ خود اس کی تصریح فرمادی۔ دخیلہِ کلبیٰ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس مصر کی بنی ہوئی باریک مملل (قباطی) آئی۔ آپ ﷺ نے اس میں سے ایک طکڑا مجھے دیا اور فرمایا ایک حصہ پھاڑ کر اپنا کرتہ بنالو اور ایک حصہ اپنی بیوی کو دوپٹہ بنانے کے لیے دے دو، مگر ان سے کہہ دینا کہ **تجعل تحته ثواباً** یصفہ اس کے نیچے ایک اور کپڑا گالیں تاکہ جسم کی ساخت اندر سے نہ جھلکے۔ (ابوداؤد، کتاب اللباس)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 37 ▲

یعنی جس حلقے میں ایک عورت اپنی پوری زینت کے ساتھ آزادی سے رہ سکتی ہے وہ ان لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہیں، خواہ وہ رشته دار ہوں یا جنہیں، بہر حال ایک عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے سامنے زیب و زینت کے ساتھ آئے۔ **وَلَا يُبَدِّلُنَ زِينَتَهُنَ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** کے فقرے میں جو حکم دیا گیا تھا اس کا مطلب یہاں کھول دیا گیا ہے کہ اس محدود حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہوں، ان کے سامنے ایک عورت کو اپنی آرائش قصد آیا ہے پر وہی کے ساتھ خود نہ ظاہر کرنی چاہیے، البتہ جوان کی کوشش کے باوجود یہاں کے ارادے کے بغیر ظاہر ہو جائے، یا جس کا چھپانا ممکن نہ ہو وہ اللہ کے ہاں معاف ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 38 ▲

اصل میں لفظ **ابتاء** استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا پر دادا اور نانا پر نانا بھی شامل ہیں۔ لہذا ایک عورت اپنی ددھیاں اور نہیاں، اور اپنے شوہر کی ددھیاں اور نہیاں کے ان سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آسکتی ہے جس طرح اپنے والد اور خسر کے سامنے آسکتی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 39 ▲

بیٹیوں میں پوتے پر پوتے اور نواسے پر نواسے سب شامل ہیں۔ اور اس معاملے میں سگے سوتیلے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنے سوتیلے بچوں کی اولاد کے سامنے عورت اسی طرح آزادی کے ساتھ اظہار زینت کر سکتی ہے جس طرح خود اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے سامنے کر سکتی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 40 ▲

"بھائیوں" میں سگے اور سوتیلے اور ماں جائے بھائی سب شامل ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 41 ▲

بھائی بہنوں کے بیٹوں سے مراد تینوں قسم کے بھائی بہنوں کی اولاد ہے، یعنی ان کے پوتے پر پوتے اور نواسے پر نواسے سب اس میں شامل ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 42 ▲

یہاں چونکہ رشتہ داروں کا حلقة ختم ہو رہا ہے اور آگے غیر رشتہ دار لوگوں کا ذکر ہے، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے تین مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے، کیونکہ ان کو نہ سمجھنے سے متعدد انجمنیں واقع ہوتی ہیں: پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اظہار زینت کی آزادی کو صرف ان رشتہ داروں تک محدود سمجھتے ہیں جن کا نام یہاں لیا گیا ہے، باقی سب لوگوں کو، حتیٰ کہ سگے چچا اور سگے ماہوں تک کو ان رشتہ داروں میں شمار کرتے ہیں جن سے پر دہ کیا جانا چاہیے۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ انکا نام قرآن میں نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سگے چچا اور ماہوں تو در کنار، نبی ﷺ نے تو رضاعی چچا اور ماہوں سے بھی پر دہ کرنے کی حضرت عائشہؓ کو اجازت نہ دی۔ صحاح ستہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی اپنی روایت ہے کہ ابو القعیدیں کے بھائی افغان کے ہاں آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ چونکہ پر دے کا حکم آچکا تھا اس لیے حضرت عائشہؓ نے اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہلا کر بھیجا کہ تم تو میری بھتیجی ہو، کیونکہ میرے بھائی ابو

القعیس کی بیوی کاتم نے دودھ پیا ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کو اس میں تأمل تھا کہ یہ رشتہ بھی ایسا ہے جس میں پرده اٹھاد دینا جائز ہو۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تمہارے پاس آسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے خود اس آیت کو اس معنی میں نہیں لیا ہے کہ اس میں جن جن رشتہ داروں کا ذکر آیا ہے ان سے پرده نہ ہو۔ اور باقی سب سے ہو۔ بلکہ آپ ﷺ نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ جن جن رشتہ داروں سے ایک عورت کا نکاح حرام ہے وہ سب اسی آیت کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً پچا، ماموں، داماد اور رضاعی رشتہ دار۔ تابعین میں سے حضرت حسن بصریؓ نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، اور اسی کی تائید علامہ ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمائی ہے (ج-3، ص-390)۔

دوسری مسئلہ یہ ہے کہ جن رشتہ داروں سے ابدی حرمت کا رشتہ نہ ہو (یعنی جن سے ایک کنواری یا بیوہ عورت کا نکاح جائز ہو) وہ نہ تو محرم رشتہ داروں کے حکم میں ہیں کہ عورتیں بے تکلف ان کے سامنے اپنی زینت کے ساتھ آئیں، اور نہ بالکل اجنیوں کے حکم میں کہ عورتیں ان سے ویسا ہی مکمل پرده کریں جیسا غیروں سے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ٹھیک ٹھیک کیا رویہ ہونا چاہیے، یہ شریعت میں متعین نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا تعین ہو نہیں سکتا۔ اس کے حدود مختلف رشتہ داروں کے معاملے میں ان کے رشتے، ان کی عمر، عورت کی تعلقات و روابط، اور فریقین کے حالات (مثلاً مکان کا مشترک ہونا یا الگ الگ مکانوں میں رہنا) کے لحاظ سے لا محالہ مختلف ہوں گے اور ہونے چاہیں۔ اس معاملے میں نبی ﷺ کا اپنا طرز عمل جو کچھ تھا اس سے ہم کو یہی رہنمائی ملتی ہے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر، جو نبی ﷺ کی سالی تھیں، آپ ﷺ کے سامنے ہوتی تھیں، اور آخر وقت تک آپ ﷺ کے اور ان کے درمیان کم از کم چھرے اور ہاتھوں کی حد تک کوئی پرده نہ تھا۔ جنہے الوداع نبی ﷺ کی وفات سے صرف چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے اور اس وقت بھی یہی حالت قائم تھی (ملحوظہ

ہو ابو داؤد، کتاب الحج، باب المحرم یو ڈب غلامہ)۔ اسی طرح حضرت ام ہانیؓ، جو ابو طالب کی صاحبزادی اور نبی ﷺ کی چپا زاد بہن تھیں، آخر وقت تک حضور ﷺ کے سامنے ہوتی رہیں، اور کم از کم منہ اور چہرے کا پردہ انہوں نے آپ سے کبھی نہیں کیا۔ فتح مکہ کے موقع کا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتی ہیں جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے (ملاحظہ ہو ابو داؤد، کتاب الصوم، باب فی النیہ فی الصوم والرخصۃ فیہ)۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عباسؓ اپنے بیٹے فضلؓ کو، اور ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب (نبی ﷺ کے حقیقی چپا زاد بھائی) اپنے بیٹے عبدالمطلب کو نبی ﷺ کے ہاں یہ کہہ کر بھیجتے ہیں کہ اب تم لوگ جوان ہو گئے ہو، تمہیں جب تک روزگار نہ ملے تمہاری شادیاں نہیں ہو سکتیں، لہذا تم رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر نوکری کی درخواست کرو۔ یہ دونوں حضرت زینبؓ کے مکان پر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت زینبؓ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ اور عبدالمطلب بن ربیعہ کے والد سے بھی ان کا وہی رشتہ ہے جو فضلؓ سے۔ لیکن وہ ان دونوں کے سامنے نہیں ہوتیں اور حضور ﷺ کی موجودگی میں ان کے ساتھ پر دے کے پیچھے سے بات کرتی ہیں (ابو داؤد، کتاب الخراج)۔ ان دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر دیکھا جائے تو مسئلہ کی صورت وہی کچھ سمجھ میں آتی ہے جو اوپر ہم بیان کر آئے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جہاں رشتے میں شبہ پڑ جائے وہاں محرم رشتہ دار سے بھی احتیاطاً پردہ کرنا چاہیے۔ بخاری و مسلم اور ابو داؤد میں ہے کہ حضرت سودہ ام المومنین کا ایک بھائی لوڈی زادہ تھا (یعنی ان کے باپ کی لوڈی کے بطن سے تھا) اس کے متعلق حضرت سعد بن ابی و قاص کو ان کے بھائی عتبہ نے وصیت کی کہ اس لڑکے کو اپنا بھتیجا سمجھ کر اس کی سر پرستی کرنا، کیونکہ وہ دراصل میرے نطفے سے ہے۔ یہ مقدمہ نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ کا دعویٰ یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ "بیٹا اس کا جس کے بستر

پر وہ پیدا ہوا، رہازی تو اس کے حصے میں کنکر پتھر۔ لیکن ساتھ ہی آپ نے حضرت سودہ سے فرمایا کہ اس لڑکے سے پردہ کرنا (احتیجی منه)، کیونکہ یہ اطمینان نہ رہا تھا کہ وہ واقعی ان کا بھائی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 43 ▲

اصل میں لفظ **نساءٰ** استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے "ان کی عورتیں"۔ اس سے کون عورتیں مراد ہیں، یہ بحث تو بعد کی ہے۔ سب سے پہلے جو بات قابل غور اور قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ محض "عورتوں" (**النساءٰ**) کا لفظ استعمال نہیں کیا جس سے مسلمان عورت کے لیے تمام عورتوں اور ہر قسم کی عورتوں کے سامنے بے پردہ ہونا اور اظہار زینت کرنا جائز ہو جاتا، بلکہ **نساءٰ** کہہ کر عورتوں کے ساتھ اس کی آزادی کو بہر حال ایک خاص دائرے تک محدود کر دیا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ دائرة کوئی ساہو۔ اب رہایہ سوال کہ یہ کون سا دائرة ہے، اور وہ کون عورتیں ہیں جن پر لفظ **نساءٰ** کا اطلاق ہوتا ہے، اس میں فقهاء اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمی ہوں یا کسی اور قسم کی، ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح مردوں سے کیا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ، مجاہد اور ابن جریج کی یہی رائے ہے، اور یہ لوگ اپنی تائید میں یہ واقعہ بھی پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا "میں نے سنا ہے مسلمانوں کی بعض عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے لگی ہیں۔ حالانکہ جو عورت اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ اس کے جسم پر اس کے اہل ملت کے سوا کسی اور کسی نظر پڑے"۔ یہ خط جب حضرت ابو عبیدہؓ کو ملا تو وہ ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "خدایا جو مسلمان عورت محض گوری ہونے کے لیے ان حماموں میں جائے اس کا منہ آخرت میں کالا ہو جائے"۔ (ابن جریر، بیہقی، ابن کثیر)۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں ہیں۔ امام رازی کے نزدیک یہی صحیح مطلب ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر فی الواقع اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی تھا تو پھر **نساء** کہنے کا کیا مطلب؟ اس صورت میں تو **النساء** کہنا چاہیے تھا۔

تیسرا رائے یہ ہے اور یہی معقول بھی ہے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی کہ اس سے دراصل ان کے میل جوں کی عورتیں، ان کی جانی بوجبھی عورتیں، ان سے تعلقات رکھنے والی اور ان کے کام کا ج میں حصہ لینے والی عورتیں مراد ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اور مقصود ان عورتوں کو اس دائرے سے خارج کرنا ہے جو یا تو اجنبی ہوں کہ ان کے اخلاق و تہذیب کا حال معلوم نہ ہو، یا جن کے ظاہری حالات مشتبہ ہوں اور ان پر اعتماد نہ کیا جاسکے۔ اس رائے کی تائید ان صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں نبی ﷺ کی ازواج مطہرات کے پاس ذمی عورتوں کی حاضری کا ذکر آتا ہے۔ اس معاملے میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے۔ شریف، باحیا اور نیک اطوار عورتیں جو معروف اور قابل اعتماد خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہوں، ان سے مسلمان عورتیں پوری طرح بے تکلف ہو سکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیا، آبرو باختہ اور بد اطوار عورتیں، خواہ "مسلمان" ہی کیوں نہ ہوں ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہیے، کیونکہ اخلاق کے لیے ان کی صحبت غیر مردوں کی صحبت سے کچھ کم تباہ کن نہیں ہے۔ رہیں آن جانی عورتیں، جن کی حالت معلوم نہیں ہے، تو ان سے ملاقات کی حد ہمارے نزدیک وہی ہے جو غیر محروم رشتہ داروں کے سامنے آزادی کی زیادہ سے زیادہ حد ہو سکتی ہے، یعنی یہ کہ عورت صرف منہ اور ہاتھ ان کے سامنے کھولے، باقی اپنا سارا جسم اور آرائش چھپا کر رکھے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 44 ▲

اس حکم کا مطلب سمجھنے میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ ایک گروہ اس سے مراد صرف وہ لوندیاں لیتا ہے جو کسی عورت کی ملک میں ہوں۔ ان حضرات کے نزدیک ارشاد الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ لوندی خواہ مشرک کہ ہو یا اہل کتاب میں سے، مسلمان مالکہ اس کے سامنے تواطہار زینت کر سکتی ہے مگر غلام، چاہے وہ عورت کا اپنا مملوک ہی کیوں نہ ہو، پر دے کے معاملہ میں اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی آزاد اجنبی مرد کی ہے۔ یہ عبد اللہ بن مسعود، مجاهد، حسن بصریؓ، ابن سیرین، سعید بن مسیب، طاؤس اور امام ابوحنیفہؓ کا مذہب ہے اور ایک قول امام شافعیؓ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ ان بزرگوں کا استدلال یہ ہے کہ غلام کے لیے اس کی مالکہ محروم نہیں ہے۔ اگر وہ آزاد ہو جائے تو اپنی اسی سابق مالکہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ لہذا مخصوص غلامی اس امر کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت اس کے سامنے وہ آزادی برتے جس کی اجازت محروم مردوں کے سامنے برتنے کے لیے دی گئی ہے۔ رہایہ سوال کہ **مَا مَلَكَتُ أَيْمَانُهُنَّ** کے الفاظ عام ہیں، جو لوندی اور غلام دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، پھر اسے لوندیوں کے لیے خاص کرنے کی کیا دلیل ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر موقع و محل ان کا مفہوم لوندیوں کے لیے خاص کر رہا ہے۔ پہلے **نِسَاءٌ هِنَّ** فرمایا، پھر **مَا مَلَكَتُ أَيْمَانُهُنَّ** ارشاد ہوا۔ **نِسَاءٌ هِنَّ** کے الفاظ سن کر عام آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو کسی عورت کی ملنے جلنے والی یارشته دار ہوں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ شاید لوندیاں اس میں شامل نہ ہوں۔ اس لیے **مَا مَلَكَتُ أَيْمَانُهُنَّ** کہہ کر یہ بات صاف کر دی گئی کہ آزاد عورتوں کی طرح لوندیوں کے سامنے بھی اظہار زینت کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس اجازت میں لوندی اور غلام دونوں شامل ہیں۔ یہ حضرت عائشہؓ اور امام سلمہؓ اور بعض ائمہ اہل بیت کا مذہب ہے اور امام شافعیؓ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ ان کا استدلال صرف لفظ **مَا**

مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ کے عموم ہی سے نہیں ہے بلکہ وہ سنت سے بھی اپنی تائید میں شواہد پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ نبی ﷺ ایک غلام عبد اللہ بن مسعودۃ الفزاری کو لیے ہوئے حضرت فاطمہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھیں جس سے سر ڈھانکتی تھیں تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی ﷺ نے ان کی گھبر اہٹ دیکھ کر فرمایا **لیس علیک باش، انباہو ابوک و غلامک** کوئی حرج نہیں، یہاں بس تمہارا باپ ہے اور تمہارا غلام" (ابوداؤد، احمد، بیہقی بروایت انس بن مالک۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ غلام نبی ﷺ نے حضرت فاطمہ کو دے دیا تھا، انہوں نے اسے پروردش کیا اور پھر آزاد کر دیا، مگر اس احسان کا جو بدلہ اس نے دیا وہ یہ تھا کہ جنگ صفين کے زمانے میں وہ حضرت علیؑ کا بدترین دشمن اور امیر معاویہؓ کا پر جوش حامی تھا)۔ اسی طرح وہ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اذا كان لاحد اکن مکاتب و كان له ما يؤدي فلتتحجب منه جب تم میں سے کوئی اپنے غلام سے مکاتبت کر لے اور وہ مال کتابت ادا کرنے کی مقدرت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ ایسے غلام سے پرده کرے" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بروایت ام سلمہ)

سورة النور حاشیہ نمبر: 45 ▲

اصل میں **الثِّبَاعُونَ غَيْرِ أُولِي الْأَرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ** کے الفاظ ہیں جن کا لفظی ترجمہ ہو گا "مردوں میں سے وہ مرد جو تابع ہوں خواہش نہ رکھنے والے"۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محروم مردوں کے سوا دوسرے کسی مرد کے سامنے ایک مسلمان عورت صرف اس صورت میں اظہار زینت کر سکتی ہے جبکہ اس میں دو صفات پائی جاتی ہوں: ایک یہ کہ وہ تابع، یعنی زیر دست اور ماتحت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خواہش نہ رکھنے والا ہو، یعنی اپنی عمر یا جسمانی عدم الہیت، یا عقلی کمزوری، یا فقر و مسکنست، یا زیر دستی و مکحومی کی بنا پر جس میں یہ طاقت یا جرأت نہ ہو کہ صاحب خانہ کی بیوی، بیٹی، بہن یا مام کے متعلق کوئی بری نیت دل میں لا

سکے۔ اس حکم کو جو شخص بھی فرمانبرداری کی نیت سے، نہ کہ نافرمانی کی گنجائشیں ڈھونڈنے کی نیت سے، پڑھے گا وہ اول نظر ہی میں محسوس کر لے گا کہ آج کل کے بیرے خانسامے، شوفر اور دوسرے جوان جوان نوکر تو بہر حال اس تعریف میں نہیں آتے۔ مفسرین اور فقہاء نے اس کی جو تشریحات کی ہیں ان پر

ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہل علم ان الفاظ کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں :

ابن عباسؓ: اس سے مراد وہ سیدھا بُدھو (مُغَفِّل) آدمی ہے جو عورتوں سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

قَاتِدٌ: ایسا دست نگر آدمی جو پیٹ کی روٹی پانے کے لیے تمہارے ساتھ لگا رہے۔

مجاہد: ابلہ جو روٹی چاہتا ہے اور عورتوں کا طالب نہیں ہے۔

شَعْبَيٰ: وہ جو صاحب خانہ کا تابع و دست نگر ہو اور جس کی اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ عورتوں پر نگاہ ڈال سکے۔

ابن زید: وہ جو کسی خاندان کے ساتھ لگا رہے، حتیٰ کہ گویا اسی گھر کا ایک فرد بن گیا ہو اور اسی گھر میں پلا برٹا ہو۔ جو گھروالوں کی عورتوں پر نگاہ نہ رکھتا ہو، نہ اس کی ہمت ہی کر سکتا ہو۔ وہ ان کے ساتھ اس لیے لگا رہتا ہو کہ ان سے اس کو روٹی ملتی ہے۔

طاوس اور زہری: بے و قوف آدمی جس میں نہ عورتوں کی طرف رغبت ہو اور نہ اس کی ہمت۔

(ابن جریر، ج 18۔ ص 95-96۔ ابن کثیر، ج 3 ص 285)۔

ان تشریحات سے بھی زیادہ واضح تشرح وہ واقعہ ہے جو نبی ﷺ کے زمانے میں پیش آیا تھا اور جسے بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور احمد وغیرہ محدثین نے حضرت عائشہؓ اور ام سلمہ سے روایت کیا ہے۔ مدینہ طیبہ میں ایک مختلط تھا جسے ازواج مطہرات اور دوسری خواتین غَيْرِ أُولِي الْأَرْبَةِ میں شمار کر کے اپنے ہاں آنے دیتی تھیں۔ ایک روز جب نبی ﷺ ام المومنین ام سلمہ کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے اس کو حضرت ام سلمہ کے بھائی عبد اللہ بن ابی امیہ سے با تین کرتے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل اگر طائف

فتح ہو جائے تو غیلان شَفَقِی کی بیٹی بادیہ کو حاصل کیے بغیر نہ رہنا۔ پھر اس نے باویہ کے حسن اور اس کے جسم کی تعریف کرنی شروع کی اور اس کے پوشیدہ اعضاء تک کی صفت بیان کر ڈالی۔ نبی ﷺ نے یہ بتیں سنیں تو فرمایا "خدا کے دشمن، تو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں"۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس سے پردہ کرو، آئندہ یہ گھروں میں نہ آنے پائے۔ اس کے بعد آپ نے اسے مدینے سے باہر نکال دیا اور دوسرے مختشوں کو بھی گھروں میں گھنسنے سے منع فرمادیا، کیونکہ ان کو مختسب سمجھ کر عورتیں ان سے احتیاط نہ کرتی تھیں اور وہ ایک گھر کی عورتوں کا حال دوسرے مردوں سے بیان کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ **غَيْرِ أُولِي الْأَرْبَةِ** ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص جسمانی طور پر بد کاری کے لاکن نہیں ہے۔ اگر اس میں دبی ہوئی صنفی خواہشات موجود ہیں اور وہ عورتوں سے دلچسپی رکھتا ہے تو بہر حال وہ بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا ہے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 46

یعنی جن میں ابھی صنفی احساسات بیدار نہ ہوئے ہوں۔ یہ تعریف زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس کی عمر تک کے لڑکوں پر صادق آسکتی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کے لڑکے اگرچہ نابالغ ہوں، مگر ان میں صنفی احساسات بیدار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 47

نبی ﷺ نے اس حکم کو صرف زیوروں کی جھنکار تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ اس سے یہ اصول اخذ فرمایا ہے کہ نگاہ کے سوادوسرے حواس کو مشتعل کرنے والی چیزیں بھی اس مقصد کے خلاف ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اظہار زینت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ خوشبو لوگا کر باہر نہ نکلیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا **لَا تَبْنِعُوا امَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ**

ولکن لیخراجن وہن تفلات اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو، مگر وہ خوشبو لگا کرنے آئیں"۔ (ابوداؤد، احمد)۔ اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک عورت مسجد سے نکل کر جا رہی تھی کہ حضرت ابو ہریرہ اس کے پاس سے گزرے اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے۔ انہوں نے اسے روک کر پوچھا "اے خدائے جبار کی بندی، کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟" اس نے کہا ہاں۔ بولے "میں نے اپنے محبوب ابو القاسم ﷺ کو یہ فرماتے سنائے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ گھر جا کر غسل جنابت نہ کر لے" (ابوداؤد، ابن ماجہ، احمد، نسائی)۔ ابو موسیٰ اشعریٰ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اذا استعطرت المرأة فبرت على القوم ليجدوا ريحها فهى كذا و كذا قال قولا شديداً جو عورت عطر لگا کر راستے سے گزرے تاکہ لوگ اس کی خوشبو سے لطف اندوڑ ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال فرمائے" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)۔ آپ ﷺ کی ہدایت یہ تھی کہ عورتوں کو وہ خوشبو استعمال کرنی چاہیے جس کارنگ تیز ہو اور بوہلکی ہو (ابوداؤد)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ عورتیں بلا ضرورت اپنی آواز مردوں کو سنائیں۔ ضرورت پڑنے پر بات کرنے کی اجازت تو خود قرآن میں دی گئی ہے، اور لوگوں کو دینی مسائل خود نبی ﷺ کی ازواج مطہرات بتایا کرتی تھیں۔ لیکن جہاں اس کی نہ ضرورت ہو اور نہ کوئی دینی یا اخلاقی فائدہ، وہاں اس بات کو پسند نہیں کیا گیا ہے کہ عورتیں اپنی آواز غیر مردوں کو سنائیں۔ چنانچہ نماز میں اگر امام بھول جائے تو مردوں کو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہیں، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے ایک ہاتھ پر دوسرہ ہاتھ مار کر امام کو متنبہ کریں۔ التسبیح للرجال والتصفیق للنساء (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 48 ▲

یعنی اُن لغزشوں اور غلطیوں سے توبہ کرو جو اس معاملے میں اب تک کرتے رہے ہو، اور آئندہ کے لیے اپنے طرز عمل کی اصلاح ان ہدایات کے مطابق کر لو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دی ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 49 ▲

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دوسری اصلاحات کا بھی ایک خلاصہ دے دیا جائے جو ان احکام کے نزول کے بعد قرآن کی روح کے مطابق نبی ﷺ نے اسلامی معاشرے میں راجح فرمائیں:

(۱) آپ ﷺ نے محرم رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں دوسرے لوگوں کو (خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں) کسی عورت سے تہاں ملنے اور اس کے پاس تہاں بیٹھنے سے منع فرمادیا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لا تلجموا على المغيبات فان الشيطان يجرى من احدكم مجرى الدم جن عورتوں کے شوہر باہر گئے ہوئے ہوں ان کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ شیطان تم میں سے ایک شخص کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے" (ترمذی)۔ انہی حضرت جابر کی دوسری روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يخلون بأمرأة ليس معها ذو محرم منها فان ثالثهما الشيطان جو شخص اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتا ہو وہ کبھی کسی عورت سے تہائی میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس عورت کا کوئی محرم نہ ہو، کیونکہ تیسرا اس وقت شیطان ہوتا ہے" (احمد)۔ قریب قریب اسی مضمون کی ایک اور روایت امام احمد نے عامر بن ربعہ سے نقل کی ہے۔ اس معاملے میں حضور ﷺ کی اپنی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ رات کے وقت آپ ﷺ حضرت صفیہؓ کے ساتھ ان کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں دو انصاری پاس سے گزرے۔ آپ ﷺ نے ان کو روک کر ان سے فرمایا یہ میرے ساتھ میری بیوی صفیہ ہیں۔ انہوں نے عرض کیا سبحان اللہ، یا رسول اللہ ﷺ، بھلا آپ کے متعلق بھی

کوئی بد گمانی ہو سکتی ہے؟ فرمایا شیطان آدمی کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے، مجھے اندیشه ہوا کہیں وہ تمہارے دل میں کوئی بر اگمان نہ ڈال دے (ابوداؤد، کتاب الصوم)۔

(۲) آپ ﷺ نے اس کو بھی جائز نہیں رکھا کہ کسی مرد کا ہاتھ کسی غیر محروم عورت کے جسم کو لگے۔ چنانچہ آپ ﷺ مردوں سے بیعت تو ہاتھ میں ہاتھ لے کر کرتے تھے، لیکن عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ آپ ﷺ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "نبی ﷺ کا ہاتھ کبھی کسی غیر عورت کے جسم کو نہیں لگا۔ آپ ﷺ عورت سے صرف زبانی عہد لیتے تھے اور جب وہ عہد کر چکتی تھی تو فرماتے، جاؤ بس تمہاری بیعت ہو گئی" (ابوداؤد، کتاب الخراج)۔

(۳) آپ ﷺ نے عورت کو محروم کے بغیر تہایا غیر محروم کے ساتھ سفر کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمادیا۔ بخاری و مسلم میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے خطبہ میں فرمایا لا يخلون رجل بامرأة إلا و معها ذو محرم، ولا تسافر المرأة لامع ذي محرم کوئی مرد کسی عورت سے خلوت میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محروم نہ ہو، اور کوئی عورت سفر نہ کرے جب تک کہ اس کا کوئی محروم اس کے ساتھ نہ ہو۔ ایک شخص نے اٹھ کر عرض کیا میری بیوی حج کو جا رہی ہے اور میرا نام فلاں مہم پر جانے والوں میں لکھا جا چکا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا فانطلاق فحج مع امرأتك اچھا تو تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کو چلے جاؤ۔ اس مضمون کی متعدد احادیث ابن عمر، ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ سے معتبر کتب حدیث میں مروی ہیں جن میں صرف مدت سفر یا مسافت سفر کے اعتبار سے اختلاف بیان ہے، مگر اس امر میں اتفاق ہے کہ کسی مومن عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کو مانتا ہو، محروم کے بغیر سفر کرنا حلال نہیں ہے۔ ان میں سے کسی حدیث میں 12 میل یا اس سے زیادہ کے سفر پر پابندی کا ذکر ہے، کسی میں ایک دن، کسی میں ایک شب و روز، کسی میں دو دن اور کسی میں تین دن کی حد بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان احادیث کو نہ تو

ساقط الاعتبار بنا دیتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے یہی ضروری ہے کہ ان میں سے کسی ایک روایت کو دوسرا روایتوں پر ترجیح دے کر اس حد کو قانونی مقدار قرار دینے کی کوشش کریں جو اس روایت میں بیان ہوئی ہو۔ اس لیے کہ اس اختلاف کی یہ معقول وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ مختلف موقع پر جیسی صورت معاملہ حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوئی ہوا سی کے لحاظ سے آپ ﷺ نے حکم بیان فرمایا ہو۔ مثلاً کوئی عورت تین دن کی مسافت پر جا رہی ہو اور آپ ﷺ نے اسے محرم کے بغیر جانے سے منع فرمایا ہو، اور کوئی ایک دن کی مسافت پر جا رہی ہو اور آپ ﷺ نے اسے بھی روک دیا ہو۔ اس میں مختلف سائلوں کے الگ الگ حالات اور ہر ایک کو آپ ﷺ کے مختلف جوابات اصل چیز نہیں ہیں، بلکہ اصل چیزوہ قاعدہ ہے جو اپر ابن عباسؓ والی روایت میں ارشاد ہوا ہے، یعنی سفر، جسے عرف عام میں سفر کہا جاتا ہے، محرم کے بغیر کسی عورت کو نہ کرنا چاہیے۔

(۲) آپ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو روکنے کی عملاء بھی کوشش فرمائی اور قولاء بھی اس سے منع فرمایا اسلامی زندگی میں جمعہ اور جماعت کی جواہمیت ہے، کسی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔ جمعہ کو اللہ نے خود فرض کیا ہے، اور نماز با جماعت کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا عندر مسجد میں حاضر نہ ہو اور اپنے گھر میں نماز پڑھے تو نبی ﷺ کے قول کے مطابق اس کی نماز مقبول ہی نہیں ہوتی (ابو داؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، حاکم، بر روایت ابن عباسؓ)۔ لیکن نبی ﷺ نے عورتوں کو جمعہ کی فرضیت سے مستثنی قرار دیا (ابو داؤد بر روایت ام عطیہ، دارقطنی و بیہقی بر روایت جابر، ابو داؤد دو حاکم بر روایت طارق بن شہاب)۔ اور نماز با جماعت میں عورتوں کی شرکت نہ صرف یہ کہ لازم نہیں رکھی بلکہ اس کی اجازت ان الفاظ میں دی کہ اگر وہ آنا چاہیں تو انہیں روکو نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرمادی کہ ان کے لیے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ امن عمر اور ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے

فَرِمَا يَا لَاتَّبِعُوا أَمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ الَّذِي بَنَدِيُوْلُ كَوَالِلَّهِ كَمِسَاجِدِهِ مِنْ آنَى سَمِعَ نَهَرَ وَ" (ابوداؤد)۔

دوسری روایت ابن عمرؓ سے ان الفاظ اور ان سے ملتے جلتے الفاظ میں ہیں ائذنوا للنساء الى المساجد

بالليل عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت دو" (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابو

داود)۔ اور ایک روایت ان الفاظ میں ہے لاتَّبِعُوا نِسَاءَ كَمِ الْمَسَاجِدِ وَ بِيَوْتِهِنَ خَيْرٌ لَهُنَ، اپنی عورتوں کو

مسجدوں میں آنے سے روکو نہیں، اگرچہ ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں" (احمد، ابو داؤد)۔ ام حمید

ساعدیہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ فرمایا

"تمہارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمہارا اپنے گھر ہی میں نماز پڑھنا

اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمہارا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے

سے بہتر ہے" (احمد، طبرانی)۔ قریب قریب اسی مضمون کی روایت ابو داؤد میں عبد اللہ بن مسعود سے

مرروی ہے، اور حضرت ام سلمہ کی روایت میں نبی ﷺ کے الفاظ یہ ہیں خير مساجد النساء قعرب يوتهن

عورتوں کے لیے بہترین مسجد ان کے گھروں کے اندر ورنی حصے ہیں" (احمد، طبرانی)۔ لیکن حضرت عائشہؓ

دور بنت اُمیمیہ کی حالت دیکھ کر فرماتی ہیں "اگر نبی ﷺ عورتوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے جواب ہیں تو ان کا

مسجدوں میں آنا اسی طرح بند فرمادیتے جس طرح بنت اسرائیل کی عورتوں کا آنا بند کیا گیا تھا" (بخاری، مسلم،

ابو داؤد)۔ مسجد نبوی ﷺ میں حضور ﷺ نے عورتوں کے داخل ہونے کے لیے ایک الگ دروازہ

مخصوص کر دیا تھا، اور حضرت عمر اپنے دور حکومت میں مردوں کو اس دروازے سے آنے جانے کی سخت

ممانعت فرماتے تھے (ابو داؤد، باب اعتزال النساء في المساجد اور باب ماجاء في خروج النساء الى المساجد)۔

جماعت میں عورتوں کی صفائی مردوں سے پیچھے رکھی جاتی تھیں اور نماز کے خاتمے پر حضور ﷺ سلام

پھیرنے کے بعد کچھ دیر توقف فرماتے تھے تاکہ مردوں کے اٹھنے سے پہلے عورتیں اٹھ کر چلی جائیں (احمد،

بخاری، برداشت ام سلمہ)۔ آپ ﷺ کا ارشاد تھا کہ مردوں کی بہترین صفت سب سے آگے کی صفت ہے اور بدترین صفت سب سے پچھے (یعنی عورتوں سے قریب) کی صفت۔ اور عورتوں کی بہترین صفت سب سے پچھے کی صفت ہے اور بدترین صفت سب سے آگے کی (یعنی مردوں سے قریب کی) صفت ہے (مسلم۔ ابو داؤد، ترمذی نسائی، احمد)۔ عیدین کی نماز میں عورتیں شریک ہوتی تھیں مگر ان کی جگہ مردوں سے الگ تھی اور نبی ﷺ خاطبے کے بعد عورتوں کی طرف جا کر ان کو الگ خطاب فرماتے تھے (ابو داؤد برداشت جابر بن عبد اللہ۔ بخاری و مسلم برداشت بن عباس)۔ ایک مرتبہ مسجد نبوی ﷺ کے باہر آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ راستے میں مرد اور عورت سب گلڈ ہو گئے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے عورتوں سے فرمایا استاخرن فانہ لیس لکن ان تھتضن الطریق، علیکن بحافات الطریق پھر جاؤ، تمہارے لیے سڑک کے پیچ میں چنان درست نہیں ہے، کنارے پر چلو۔ یہ ارشاد سننے ہی عورتیں کنارے ہو کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں (ابو داؤد)۔ ان احکام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجلس اسلام کے مزاج سے کیسی سخت مغایرت رکھتی ہے۔ جو دین خدا کے گھر میں عبادت کے موقع پر بھی دونوں صنفوں کو خلط ملط نہیں ہونے دیتا اس کے متعلق کون تصور کر سکتا ہے کہ وہ کالجوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور جلسوں میں اسی اختلاط کو جائز رکھے گا۔

(۵) عورتوں کو اعتدال کے ساتھ بناؤ سنگھار کرنے کی آپ ﷺ نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ بسا اوقات خود اس کی ہدایت فرمائی ہے، مگر اس میں حد سے گزر جانے کو بڑی سختی کے ساتھ روکا ہے۔ اس زمانے میں جس قسم کے بناؤ سنگھار عرب کی عورتوں میں رائج تھے ان میں سے حسب ذیل چیزوں کو آپ ﷺ نے قابل لعنت اور سب ہلاکت اقوام قرار دیا: اپنے بالوں میں دوسرے بال ملا کر ان کو زیادہ لمبا اور گھناد کھانے کی کوشش کرنا۔ جسم کے مختلف حصوں کو گودنا اور مصنوعی ٹل بنانا۔ بال اکھاڑ اکھاڑ کر بھویں

خاص وضع میں بنانا اور روئیں نوچ نوچ کر منہ صاف کرنا۔ دانتوں کو گھس کر باریک بنانا، یاد انتوں کے درمیان مصنوعی چھینیاں پیدا کرنا۔ زعفران یا اورس وغیرہ کے مصنوعی ابٹنے مل کر چہرے پر مصنوعی رنگ پیدا کرنا۔ یہ احکام صحاح ستہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہؓ، حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر، حضرت عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، اور امیر معاویہؓ سے معتبر سندوں کے ساتھ مردی ہیں۔

اللہ اور رسول ﷺ کی ان صاف صاف ہدایات کو دیکھ لینے کے بعد ایک مومن انسان کے لیے دو ہی صور تیں رہ جاتی ہیں۔ یا تو وہ ان کی پیروی کرے اور اپنی، اپنے گھر کی اور اپنے معاشرے کی زندگی کو ان اخلاقی فتنوں سے پاک کر دے جن کے سد باب کے لیے اللہ نے قرآن میں اور اسکے رسول ﷺ نے سنت میں اس قدر تفصیلی احکام دیے ہیں۔ یا پھر اگر وہ اپنے نفس کی کمزوری کے باعث ان کی یا ان میں سے کسی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کم از کم اسے گناہ سمجھتے ہوئے کرے اور اس کو گناہ مانے، اور خواہ مخواہ کی تاویلیوں سے گناہ کو صواب بنانے کی کوشش نہ کرے۔ ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر جو لوگ قرآن و سنت کے صریح احکام کے خلاف مغربی معاشرت کے طور طریقے اختیار کر لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پھر ان ہی کو عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور علانیہ دعوے کرتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں سرے سے پردے کا حکم موجود ہی نہیں ہے، وہ گناہ اور نافرمانی پر جہالت اور منافقانہ ڈھنٹائی کا اور اضافہ کر لیتے ہیں جس کی قدر نہ دنیا میں کوئی شریف آدمی کر سکتا ہے نہ آخرت میں خدا سے اس کی امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں تو مناققوں سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا اور رسول ﷺ کے ان احکام کو غلط اور ان طریقوں کو صحیح و برحق سمجھتے ہیں جو انہوں نے غیر مسلم قوموں سے سیکھے ہیں۔ یہ لوگ در حقیقت مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ اس کے بعد بھی اگر وہ مسلمان ہوں تو پھر اسلام اور کفر کے الفاظ قطعاً بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے نام بدل دیتے اور علانیہ اسلام سے نکل جاتے

تو ہم کم از کم ان کی اخلاقی جرأت کا اعتراف کرتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ خیالات رکھتے ہوئے بھی وہ مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ انسانیت کی اس سے زیادہ ذلیل قسم غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ اس سیرت و اخلاق کے لوگوں سے کوئی جعل سازی، کوئی فریب، کوئی دغabaزی اور کوئی خیانت بھی خلاف توقع نہیں ہے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 50

اصل میں لفظ آیامی استعمال ہوا ہے جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں۔ آیامی جمع ہے آیمہ کی، اور آیمہ ہر اس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو، اور ہر اس عورت کو کہتے جس کا کوئی شوہرنہ ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ مجرد کیا ہے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 51

یعنی جن کا رویہ تمہارے ساتھ بھی اچھا ہو، اور جن میں تم یہ صلاحیت بھی پاؤ کہ وہ ازدواجی زندگی نباہ لیں گے۔ مالک کے ساتھ جس غلام یاalonڈی کا رویہ ٹھیک نہ ہو اور جس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بھی نہ ہو کہ شادی ہونے کے بعد اپنے شریک زندگی کے ساتھ اس کا نباہ ہو سکے گا، اس کا نکاح کر دینے کی ذمہ داری مالک پر نہیں ڈالی گئی ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے فرد کی زندگی کو خراب کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہ شرط آزاد آدمیوں کے معاملے میں نہیں لگائی گئی، کیونکہ آزاد آدمی کے نکاح میں حصہ لینے والے کی ذمہ داری در حقیقت ایک مشیر، ایک معاون اور ایک ذریعہ تعارف سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اصل رشتہ نلک اور منکوح کی اپنی ہی رضا مندی سے ہوتا ہے۔ لیکن غلام یاalonڈی کا رشتہ کرنے کی پوری ذمہ داری

اس کے مالک پر ہوتی ہے۔ وہ اگر جان بوجھ کر کسی غریب کو ایک بد مزاج اور بد سرشت آدمی کے ساتھ بندھوادے تو اس کا سارا اوپال اسی کے سر ہو گا۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 52 ▲

اظہر یہاں صیغہ امر دیکھ کر علماء کے ایک گروہ نے یہ خیال کر لیا کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ حالانکہ معاملے کی نوعیت خود بتاہی ہے کہ یہ حکم وجوب کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کا نکاح کر دینا دوسروں پر کیسے واجب ہو سکتا ہے؟ اخر کس کا کس نکاح کر دینا واجب ہو؟ اور بلفرص اگر واجب ہو بھی تو خود اس شخص کی کیا حیثیت رہی جس کا نکاح پیش نظر ہے؟ کیا دوسرے لوگ جہاں بھی اس کا نکاح کرنا چاہیں اسے قبول کر لینا چاہیے؟ اگر یہ اس پر فرض ہے تو گویا اس کے نکاح میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں۔ اور اگر اسے انکار کا حق ہے تو جن پر یہ کام واجب ہے وہ آخر اپنے فرض سے کس طرح سبکدوش ہوں؟ ان ہی پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جمہور فقہاء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کام کو واجب نہیں بلکہ مندوب قرار دیتا ہے، یعنی اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر یہ فکر ہونی چاہیے کہ ان کے معاشرے میں لوگ بن بیا ہے نہ بیٹھے رہیں۔ خاندان والے، دوست، ہمسایہ سب اس معاملے میں دلچسپی لیں، اور جس کا کوئی نہ ہو اس کو حکومت اس کام میں مدد دے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 53 ▲

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کا بھی نکاح ہو جائے گا اللہ اس کو مال دار بنا دے گا، بلکہ مدعایہ ہے کہ لوگ اس معاملے میں بہت زیادہ حسابی بن کرنے رہ جائیں۔ اس میں لڑکی والوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ نیک اور شریف آدمی اگر ان کے ہاں پیغام دے تو محض اس کی غربت دیکھ کر انکار نہ کر دیں۔ لڑکے والوں کو بھی تلقین ہے کہ کسی نوجوان کو محض اس لیے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کمار ہا ہے۔ اور نوجوانوں کو بھی نصیحت ہے کہ زیادہ کشاش کے انتظار میں اپنی شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ تھوڑی

آدمی بھی ہو تو اللہ کے بھروسے پرشادی کر ڈالنی چاہیے۔ بسا اوقات خود شادی ہی آدمی کے حالات درست ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بیوی کی مدد سے اخراجات قابو میں آجاتے ہیں۔ ذمہ داریاں سر پر آجائے کے بعد آدمی خود بھی پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش کرنے لگتا ہے۔ بیوی معاش کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مستقبل میں کس کے لیے کیا لکھا ہے، اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اچھے حالات برے حالات میں بھی بدل سکتے ہیں اور برے حالات اچھے حالات میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ لہذا آدمی کو ضرورت سے زیادہ حساب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 54 ▲

ان آیات کی بہترین تفسیر و احادیث ہیں جو اس سلسلہ میں نبی ﷺ سے مردی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: يَا مَعْشِرَ الشَّبَابِ، مَنْ أَسْتَطَاعَ مِنْكُمْ الْبَاءَةَ فَلِيَتَزُوْجْ فَانْهُ أَغْضَ لِلْبَصَرِ وَ أَحْسَنَ لِلْفَرَجِ وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلِيهِ بِالصُّومِ فَإِنَّهُ لَهُ وَجَاءَ، نَوْجَانُو، ثُمَّ مِنْ سَبَقِهِ كَمْ رَكَّنَهُ كَبُرَا
شادی کر سکتا ہوا سے کر لینی چاہیے کیونکہ یہ نگاہ کو بد نظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے، کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں"۔ (بخاری و مسلم)۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ثَلَاثَةٌ حَقٌ عَلَى اللَّهِ عَوْنَاهُمْ، النَّاكِحُ يَرِيدُ الْعَفَافَ، وَالْمَكَاتِبُ يَرِيدُ الْإِدَاعَ، وَالْغَازِي فِي سَبِيلِ اللهِ تِينَ آدَمِيٌّ هُنَّ جَنَّ كَمْ دَرَّ اللَّهُ كَذَمَّ هُنَّ، اِيكَ وَهُ شَخْصٌ جُو پَاكَ دَامِنَ رَهْنَهُ كَلِيَ نَكَاحَ كَرَّهُ، دَوْسَرَهُ وَهُ مَكَاتِبُ جُو مَالَ كَتَابَتَ اِداَكَرَنَهُ كَنِيتَ رَكَّهُ، تِيَسِرَهُ وَهُ شَخْصٌ جُو اللَّهُ كَرِيَ رَاهَ مِنْ جَهَادَ كَلِيَ نَكَلَهُ" (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، النساء، آیت 25)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 55 ▲

مکاتبت کے لفظی معنی تو ہیں "لکھا پڑھی،" مگر اصطلاح میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لوندی اپنی آزادی کے لیے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے اور جب آقا سے قبول کر لے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہو جائے۔ اسلام میں غلاموں کی آزادی کے لیے جو صورتیں رکھی گئی ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ معاوضہ مال ہی کی شکل میں ہو۔ آقا کے لیے کوئی خاص خدمت انجام دینا بھی معاوضہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ فریقین اس پر راضی ہو جائیں۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد آقا کو یہ حق نہیں رہتا کہ غلام کی آزادی میں بیجار کا وٹیں ڈالے۔ وہ اس کو مال کتابت فراہم کرنے کے لیے کام کرنے کا موقع دے گا اور مدت مقررہ کے اندر جب بھی غلام اپنے ذمے کی رقم یا خدمت انجام دے دے وہ اس کو آزاد کر دے گا۔ حضرت عمر کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے مکاتبت کی اور مدت مقررہ سے پہلے ہی مال کتابت فراہم کر کے اس کے پاس لے گیا۔ مالکہ نے کہا کہ میں تو یک مشت نہ لوں گی بلکہ سال بسال اور ماہ بماہ قسطوں کی صورت میں لوں گی۔ غلام نے حضرت عمر سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا یہ رقم بیت المال میں داخل کر دے اور جاتو آزاد ہے۔ پھر مالکہ کو کہلا بھیجا کہ تیری رقم یہاں جمع ہو چکی ہے، اب تو چاہے یک مشت لے لے ورنہ ہم تجھے سال بسال اور ماہ بماہ دیتے رہیں گے (دارقطنی بر وايت ابو سعيد مقربي)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 56 ▲

اس آیت کا مطلب فقهاء کے ایک گروہ نے یہ لیا ہے کہ جب کوئی لوندی یا غلام مکاتبت کی درخواست کرے تو آقا پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ یہ عطاء، عمر و بن دینار، ابن سیرین، مسروق، ضحاک، عکرمه، ظاہریہ، اور ابن جریر طبری کا مسلک ہے اور امام شافعی بھی پہلے اسی کے قائل تھے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ واجب نہیں ہے بلکہ مستحب اور مندوب ہے۔ اس گروہ میں شعبی، مقاتل بن حیان، حسن نصری، عبد

الرَّحْمَنُ بْنُ زِيدٍ، سَفِيَانُ ثُوْرَى، أَبُو حُنْيَفَةَ وَأَبُو مَالِكَ بْنَ أَنْسٍ جِئِسَ بِزَرْغٍ شَامِلٌ هُوَ، وَأَرَى آخَرَ مِنْ إِمامَ شَافِعِيٍّ بَهِيٍّ
اسی کے قائل ہو گئے تھے۔ پہلے گروہ کے مسلک کی تائید دو چیزوں کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ آیت کے الفاظ ہیں
كَاتِبُوهُمْ ان سے مکاتبت کر لو۔ یہ الفاظ صاف طور پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

دوسرے یہ کہ معتبر روایات سے ثابت ہے کہ مشہور فقیہ (محدث حضرت محمد بن سیرینؓ کے والد سیرینؓ^{رض}) نے اپنے آقا حضرت انسؓ سے جب مکاتبت کی درخواست کی اور انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سیرینؓ حضرت عمر کے پاس شکایت لے گئے۔ انہوں نے واقعہ سناتودہ لے کر حضرت انسؓ پر پل پڑے اور فرمایا "اللہ کا حکم ہے کہ مکاتبت کرلو" (بخاری)۔ اس واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ذاتی فعل نہیں بلکہ صحابہؓ کی موجودگی میں کیا گیا تھا اور کسی نے اس پر اظہار اختلاف نہیں کیا، لہذا یہ اس آیت کی مستند تفسیر ہے۔ دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف **فَكَاتِبُوهُمْ** نہیں فرمایا ہے

فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ارشاد فرمایا ہے، یعنی "ان سے مکاتبت کرلو اگر ان کے اندر بھلائی پاؤ" یہ بھلائی پانے کی شرط ایسی ہے جس کا انحصار مالک کی رائے پر ہے، اور کوئی متعین معیار اس کا نہیں ہے جسے کوئی عدالت جانچ سکے۔ قانونی احکام کی یہ شان نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے اس حکم کو تلقین اور ہدایت ہی کے معنی میں لیا جائے گا نہ کہ قانونی حکم کے معنی میں۔ اور سیرینؓ کی نظر کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اس زمانے میں کوئی ایک غلام تو نہ تھا جس نے مکاتبت کی درخواست کی ہو۔ ہزار ہا غلام عہد نبوی ﷺ اور عہد خلافت راشدہ میں موجود تھے، اور بکثرت غلاموں نے مکاتبت کی ہے۔ سیرینؓ والے واقعہ کے سوا کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ کسی آقا کو عدالتی حکم کے ذریعہ سے مکاتبت پر مجبور کیا گیا ہو۔ لہذا حضرت عمرؓ کے اس فعل کو ایک عدالتی فعل سمجھنے کے بجائے ہم اس معنی میں لیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے درمیان محض قاضی ہی نہ

تھے بلکہ افراد ملت کے ساتھ ان کا تعلق باپ اور اولاد کا ساتھ۔ بسا اوقات وہ بہت سے ایسے معاملات میں بھی دخل دیتے تھے جن میں ایک باپ تو دخل دے سکتا ہے مگر ایک حاکم عدالت دخل نہیں دے سکتا۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 57

بھلائی سے مراد تین چیزیں ہیں:

ایک یہ کہ غلام میں مال کتابت ادا کرنے کی صلاحیت ہو، یعنی وہ کما کر یا محنت کر کے اپنی آزادی کا فدیہ ادا کر سکتا ہو، جیسا کہ ایک مرسل حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ان علمتم فیهم حرفة ولا ترسلوهم کلًا علی الناس اگر تمہیں معلوم ہو کہ وہ کما سکتا ہے تو مکاتبت کرو۔ یہ نہ ہو کہ اسے لوگوں سے بھیک مانگتے پھر نے کے لیے چھوڑ دو۔ (ابن کثیر بحوالہ ابو داؤد)

دوسرے یہ کہ اس میں اتنی دیانت اور راست بازی موجود ہو کہ اس کے قول پر اعتماد کر کے معاهدہ کیا جا سکے۔ ایسا نہ ہو مکاتبت کر کے وہ مالک کی خدمت سے چھٹی بھی پالے اور جو کچھ اس دوران میں کمائے اسے کھاپی کر برابر بھی کر دے۔

تیسرا یہ کہ مالک اس میں ایسے برے اخلاقی رجحانات، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے ایسے تلخ جذبات نہ پاتا ہو جن کی بنابریہ اندیشہ ہو کہ اس کی آزادی مسلم معاشرے کے لیے خطرناک ہو گی۔ بالفاظ دیگر اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہو کہ مسلم معاشرے کا ایک اچھا آزاد شہری بن سکے گا نہ کہ آستین کا سانپ بن کر رہے گا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ معاملہ جنگی قیدیوں کا بھی تھا جن کے بارے میں یہ احتیاطیں ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت تھیں۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 58

یہ عام حکم ہے جس کے مخاطب آقا بھی ہیں، عام مسلمان بھی اور اسلامی حکومت بھی۔

آقاوں کی ہدایت ہے کہ مال کتابت میں سے کچھ نہ کچھ معاف کر دو، چنانچہ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام اپنے مکاتبوں کو مال کتابت کا ایک معتدبہ حصہ معاف کر دیا کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت علی نے تو ہمیشہ $\frac{1}{4}$ حصہ معاف کیا ہے اور اس کی تلقین فرمائی ہے (ابن جریر)۔

عام مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ جو مکاتب بھی اپنا مال کتابت ادا کرنے کے لیے ان سے مدد کی درخواست کرے، وہ دل کھول کر اس کی امداد کریں۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک **فِي الرِّقَابِ** بھی ہے، یعنی "گردنوں کو بند غلامی سے رہا کرانا" (سورہ توبہ، آیت 60) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک **فَكُّ رَقَبَه** گردن کا بند کھولنا "ایک بڑی نیکی کا کام ہے (سورہ بلد آیت 13)۔ حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے آکر نبی ﷺ سے عرض کیا مجھے وہ عمل بتائیئے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "تونے بڑے مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات پوچھ ڈائی۔ غلام آزاد کر، غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے، کسی کو جانور دے تو خوب دودھ دینے والا دے، اور تیرا جور شتہ دار تیرے ساتھ ظلم سے پیش آئے اس کے ساتھ نیکی کر۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، بھلانی کی تلقین کر، برائی سے منع کر۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اپنی زبان کو روک کر رکھ۔ کھلے تو بھلانی کے لیے کھلے ورنہ بند رہے" (بیہقی فی شعب الایمان عن البرائی بن عازب)۔

اسلامی حکومت کو بھی ہدایت ہے کہ بیت المال میں جوز کوٰۃ جمع ہو اس میں سے مکاتب غلاموں کی رہائی کے لیے ایک حصہ خرچ کریں۔

اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم زمانے میں غلام تین طرح کے تھے۔ ایک جنگی قیدی۔ دوسرے، آزاد آدمی جن کو پکڑ پکڑ کر غلام بنایا اور نیچ ڈالا جاتا تھا۔ تیسرا وہ جو نسلوں سے غلام چلے آ رہے تھے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کے آباء و اجداد کب غلام بنائے گئے تھے اور دونوں قسموں میں سے کس قسم کے غلام

تھے۔ اسلام جب آیا تو عرب اور بیرون عرب، دنیا بھر کا معاشرہ ان تمام اقسام کے غلاموں سے بھرا ہوا تھا اور سارا معاشی نظام مزدوروں اور نوکروں سے زیادہ ان غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ اسلام کے سامنے پہلا سوال یہ تھا کہ یہ غلام جو پہلے سے چلے آرہے ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ اور دوسرا سوال یہ تھا کہ آئندہ کے لیے غلامی کے مسئلے کا کیا حل ہے۔ پہلے سوال کے جواب میں اسلام نے یہ نہیں کیا کہ یہ لکھت قدیم زمانے کے تمام غلاموں پر ایسے لوگوں کے حقوق ملکیت ساقط کر دیتا، کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ پورا معاشرتی و معاشی نظام مغلوب ہو جاتا، بلکہ عرب کو امریکہ کی خانہ جنگی سے بھی بدرجہ بازیادہ سخت تباہ کن خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑتا اور پھر بھی اصل مسئلہ حل نہ ہوتا جس طرح امریکہ میں حل نہ ہو سکا اور سیاہ فام لوگوں (Negroes) کی ذات کا مسئلہ بہر حال باقی رہ گیا۔ اس احمقانہ طریق اصلاح کو چھوڑ کر اسلام نے **فَكُ**

رَقْبَةٌ کی ایک زبردست اخلاق تحریک شروع کی اور تلقین و ترغیب مذہبی احکام اور ملکی قوانین کے ذریعہ سے لوگوں کو اس بات پر ابھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے طوعاً غلاموں کو آزاد کریں، یا اپنے قصوروں کے کفارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انہیں رہا کریں، یا مالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیں، اس تحریک میں نبی ﷺ نے خود 63 غلام آزاد کیے۔ آپ کی بیویوں میں سے صرف ایک بیوی حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد 67 تھی۔ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ نے اپنی زندگی میں 70 غلاموں کو آزاد کیا۔ حکیم بن ج Zam نے 100، عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار، ذو الکلاع حمیرؓ نے آٹھ ہزار، اور عبد الرحمن بن عوف نے تیس ہزار کو رہائی بخشی۔ ایسے ہی واقعات دوسرے صحابہؓ کی زندگی میں بھی ملتے ہیں جن میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے نام بہت ممتاز ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ کثرت سے خود اپنے غلام بھی آزاد کرتے تھے اور دوسروں سے بھی غلام

ذمہ داری مالک کی ہے اور وہی پکڑا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جبرا کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ رہا" دنیوی فائدوں کی خاطر "کا فقرہ، تو دراصل یہ ثبوت حکم کے لیے شرط اور قید کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے کہ اگر مالک اس کی کمائی نہ کھارہا ہو تو لوندی کو تجہی گری پر مجبور کرنے میں وہ مجرم نہ ہو، بلکہ اس سے مقصود اس کمائی کو بھی حرمت کے حکم میں شامل کرنا ہے جو اس ناجائز جبرا کے ذریعہ حاصل کی گئی ہو۔

لیکن اس حکم کا پورا مقصد مخصوص اس کے الفاظ اور سیاق و سباق سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان حالات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں یہ نازل ہوا ہے۔ اس وقت عرب میں تجہی گری کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک خانگی کا پیشہ۔ دوسرے باقاعدہ چکہ۔

"خانگی" کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لوونڈی ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔ یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد خرچ دیں گے اور اپنی حاجت رفع کرتے رہیں گے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت ان مردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے اسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلم ادارہ تھا جسے اہل جاہلیت ایک قسم کا "نکاح" سمجھتے تھے۔ اسلام نے آکر نکاح کے صرف اس معروف طریقے کو قانونی نکاح قرار دیا جس میں ایک عورت کا صرف ایک شوہر ہوتا ہے اور اس طرح باقی تمام صورتیں زنا میں شمار ہو کر آپ سے آپ جرم ہو گئیں (ابو داؤد، باب فی وجوه النکاح الـتی کان یتـنـکـحـ اہـلـ الـجـاـهـلـیـہـ)۔

دوسری صورت، یعنی کھلی تجہی گری، تمام تر لوونڈیوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لوونڈیوں پر ایک بھری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو، اور وہ

بے چاریاں بد کاری کر اکر کر یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں، اس کے سوانح کسی دوسرے ذریعہ سے وہ اتنا کما سکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعہ سے یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان لوندیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گئی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ ہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لوندیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگادیتے تھے جنہیں دیکھ کر دور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ " حاجتمند" آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں " قلیقیات " کہلاتی تھیں اور ان کے گھر " مو اخیر " کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے معزز رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔ خود عبد اللہ بن ابی (رئیس المنا فقین، وہی صاحب جنہیں نبی ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا طے کر چکے تھے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے) مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چکلہ موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لوندیاں رکھی گئی تھیں۔ ان کے ذریعہ سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی تواضع بھی ان ہی سے فرمایا کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے خدم و حشم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔ ان ہی لوندیوں میں سے ایک، جس کا نام معاذہ تھا، مسلمان ہو گئی اور اس نے توبہ کرنی چاہی۔ ابن ابی نے اس پر تشدد کیا۔ اس نے جا کر حضرت ابو بکر سے شکایت کی۔ انہوں نے معاملہ سرکارتک پہنچایا، اور سرکار رسالت مآب ﷺ نے حکم دے دیا کہ لوندی اس ظالم کے قبضے سے نکال لی جائے (ابن جریر، ج 18، ص 55 تا 58-103-104۔ الاستیعاب لا بن عبد البر، ج 2، ص 762۔ ابن کثیر، ج 3، ص 288-289)۔ یہی زمانہ تھا جب بارگاہ خداوندی سے یہ آیت نازل ہوئی۔ اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مقصود محض لوندیوں کو جرم زنا پر مجبور کرنے سے روکنا نہیں ہے بلکہ دولت اسلامیہ کے حدود میں قبہ گری

(Prostitution) کے کاروبار کو بالکل خلاف قانون قرار دے دینا ہے، اور ساتھ ساتھ ان عورتوں کے لیے اعلان معافی بھی ہے جو اس کاروبار میں جبراً استعمال کی گئی ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان آجائے کے بعد نبی ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ **لا مساعدة في الاسلام**" اسلام میں تجھے گری کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے" (ابوداؤد برداشت ابن عباس، باب فی ادعاء ولد الزنا) دوسرا حکم جو آپ ﷺ نے دیا وہ یہ تھا کہ زنا کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، ناپاک اور قطعی ممنوع ہے۔ رافع بن خدیج کی روایت ہے کہ آپ نے **مهرالبغی** یعنی زنا کے معاوضے کو خبیث اور شرّ المکاسب، ناپاک اور بدترین آمدنی قرار دیا (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)۔ ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے **كسب البغی**، یعنی پیشہ زنا سے کمائی ہوئی آمدنی کو حرام ٹھہرایا (بخاری، مسلم، احمد)۔ ابو مسعود عقبہ بن عمرو کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے **مهرالبغی** کا لین دین ممنوع قرار دیا (صحاح سنتہ و احمد)۔ تیسرا حکم آپ ﷺ نے یہ دیا کہ لوڈی سے جائز طور پر صرف ہاتھ پاؤں کی خدمت لی جاسکتی ہے اور مالک کوئی ایسی رقم اس پر عائد، یا اس سے وصول نہیں کر سکتا جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ یہ رقم وہ کہاں سے اور کیا کر کے لاتی ہے۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ **نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الاممۃ حتى یعلم من این هو**، "رسول اللہ ﷺ نے لوڈی سے کوئی آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ آمدنی اسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے" (ابوداؤد، کتاب الاجارہ)۔ رافع بن رفائم النصاری کی روایت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے کہ **نهنابی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الاممۃ الا ماعبت بیدها** قال هکذا باصابعه نحو الخبز والغزل والنفخ اللہ کے نبی ﷺ نے ہم کو لوڈی کی کمائی سے منع کیا بجز اس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے، اور آپ ﷺ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں، جیسے روئی پکانا، سوت کاتنا، یا اوں اور روئی دھنکنا (مسند احمد، ابوداؤد، وکتاب الجارہ)۔ اسی معنی میں ایک روایت

پر اس سے زیادہ سخت تنبیہ کے الفاظ اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ مگر آفرین ہے اس قوم پر جو ماشاء اللہ مومن بھی ہو اور اس حکم نامے کی تلاوت بھی کرے اور پھر ایسی سخت تنبیہ کے باوجود اس حکم نامے کی خلاف ورزی بھی کرتی رہے ۔

رکوٰہ ۵۶

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكُوٰةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زَجَاجَةٍ الْزَّجَاجَةُ كَانَهَا كَوْكِبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَرَّكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرِقَيَّةٍ وَلَا غَرْبَيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيَّءُ وَ لَوْلَمْ تَمَسَّسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ وَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨﴾ فِي بِيُوتٍ أَذْنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرُ فِيهَا أَسْمُهُ يُسَبِّحُهُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْأَصَابِلِ ﴿٢٩﴾ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَ إِقَامُ الصَّلَاةِ وَ إِيتَاءُ الزَّكُوٰةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَ الْأَبْصَارُ ﴿٣٠﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَ يَزِيدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ وَ اللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣١﴾ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٌ بِقِيَعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمَانُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدُهُ شَيْئًا وَ وَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوْفِهُ حِسَابٌ وَ اللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٣٢﴾ أَوْ كَظُلْمَتِ فِي بَحْرٍ لَّجِيٍّ يَغْشِهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلْمَتْ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكُدْ يَرَهَا وَ مَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ ﴿٣٣﴾

رکو ۵

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ 61 ﴿کائنات میں﴾ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت 62 کے نیل سے روشن کیا جاتا ہو جونہ شرقی ہونہ غربی 63، جس کا نیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، ﴿اس طرح﴾ روشنی پر روشنی ﴿بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں 64۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے 65، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ 66 ﴿اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے﴾ ان گھروں میں پانے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ 67 ان میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نمازوں اداۓ زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آجائے گی، ﴿اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں﴾ تاکہ ان کے بہترین اعمال کی جزاً کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ 68 ﴿اس کے بر عکس﴾ جنہوں نے گفر کیا 69 ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب کہ پیاساً اُس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔ 70 یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گھرے سمندر میں اندھیرا، کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اُس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ 71 جسے اللہ نور نہ بخشے اُس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔ 72

سورة النور حاشیہ نمبر: 61 ▲

یہاں سے روئے سخن منافقین کی طرف پھرتا ہے جو اسلامی معاشرے میں فتنوں پر فتنے اٹھائے چلے جا رہے تھے اور اسلام، اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست و جماعت کو زک دینے میں اسی طرح سرگرم تھے جس طرح باہر کے کھلے کھلے کافر دشمن سرگرم تھے۔ یہ لوگ ایمان کے مدعی تھے، مسلمانوں میں شامل تھے، مسلمانوں کے ساتھ، اور خصوصاً انصار کے ساتھ، رشتہ و برادری کے تعلقات رکھتے تھے، اسی لیے ان کو مسلمانوں میں اپنے فتنے پھیلانے کا زیادہ موقع ملتا تھا، اور بعض مخلص مسلمان تک اپنی سادہ لوحی یا کمزوری کی بنابر ان کے آلہ کا رب بن جاتے تھے اور پشت پناہ بھی۔ لیکن درحقیقت ان کی دنیا پرستی نے ان کی آنکھیں اندھی کر رکھی تھیں اور دعوے ایمان کے باوجود وہ اس نور سے بالکل بے بہرہ تھے جو قرآن اور محمد ﷺ کی بدولت دنیا میں پھیل رہا تھا۔ اس موقع پر ان کو خطاب کیے بغیر ان کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا جا رہا ہے اس سے مقصود تین امور ہیں۔ اول یہ کہ ان کو فہماش کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وربوبیت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جو بندہ بھی بہکا اور بھٹکا ہوا ہو اس کی تمام شرارتوں ور خباشوں کے باوجود اسے آخر وقت تک سمجھانے کی کوشش کی جائے دوم یہ کہ ایمان اور نفاق کا فرق صاف صاف کھول کر بیان کر دیا جائے تاکہ کسی صاحب عقل و خرد انسان کے لیے مسلم معاشرے کے مومن اور منافق افراد کے درمیان تمیز کرنا مشکل نہ رہے، اور اس توضیح و تصریح کے باوجود جو شخص منافقوں کے پھندے میں پھنسے یا ان کی پشتیبانی کرے وہ اپنے اس فعل کا پوری طرح ذمہ دار ہو۔ سوم یہ کہ منافقین کو صاف صاف متنبہ کر دیا جائے کہ اللہ کے جو وعدے اہل ایمان کے لئے ہیں، وہ صرف انھی لوگوں کو پہنچتے ہیں جو سچے دل سے ایمان لا سئیں اور پھر اس ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ یہ وعدے ان سب لوگوں کے لیے نہیں ہیں جو محض مسلمانوں کی مردم شماری میں شامل ہوں۔ الہذا منافقین اور فاسقین کو یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ وہاں وعدوں میں سے کوئی حصہ پا سکیں گے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 62 ▲

آسمانوں اور زمین کا لفظ قرآن مجید میں بالعموم "کائنات" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا دوسرے الفاظ میں آیت کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے۔

نور سے مراد وہ چیز ہے جس کی بدولت اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، یعنی جو آپ سے آپ ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے۔ انسان کے ذہن میں نور اور روشنی کا اصل مفہوم یہی ہے۔ کچھ نہ سوچنے کی کیفیت کا نام انسان نے اندر ہیرا اور تاریکی اور ظلمت رکھا ہے، اور اس کے بر عکس جب سب کچھ سمجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ "نور" کا استعمال اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے، نہ اس معنی میں کہ معاذ اللہ وہ کوئی شعاع ہے جو ایک لاکھ 86 ہزار میل فی سینڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کے مرکز پینائی کو منتشر کرتی ہے۔ روشنی کی یہ مخصوص کیفیت اس معنی کی حقیقت میں شامل نہیں ہے جس کے لیے انسانی ذہن نے یہ لفظ اختراع کیا ہے، بلکہ اس پر اس لفظ کا اطلاق ہم ان روشنیوں کے لحاظ سے کرتے ہیں جو اس مادی دنیا کے اندر ہمارے تجربے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے انسانی زبان کے جتنے الفاظ بھی بولے جاتے ہیں وہ اپنے اصل بنیادی مفہوم کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں نہ کہ ان کے مادی مدلولات کے اعتبار سے۔ مثلاً ہم اس کے لیے دیکھنے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان اور حیوان کی طرح آنکھ نامی ایک عضو کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے لیے سننے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ہماری طرح کانوں کے ذریعہ سے سنتا ہے۔ اس کے لیے ہم پکڑ اور گرفت کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ ہاتھ ناک کے ایک آلہ سے پکڑتا ہے۔ یہ سب الفاظ اس کے لیے ہمیشہ ایک اطلاقی شان میں بولے جاتے ہیں اور صرف ایک کم عقل آدمی ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ سماعت اور پینائی اور گرفت کی کوئی دوسری صورت اس محدود اور مخصوص قسم کی سماعت و پینائی اور گرفت کے سوا ہونی غیر ممکن ہے جو ہمارے تجربے

میں آتی ہے۔ اسی طرح "نور" کے متعلق بھی یہ خیال کرنا محض ایک تنگ خیالی ہے کہ اس کے معنی کا مصدق صرف اس شعاع ہی کی صورت میں پایا جاسکتا ہے جو کسی حملنے والے جرم سے نکل کر آنکھ کے پر دے پر منعکس ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا مصدق اس محدود معنی میں نہیں ہے بلکہ مطلق معنی میں ہے، یعنی اس کائنات میں وہی ایک اصل "سبب ظہور" ہے، باقی یہ ان تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری روشنی دینے والی چیزیں بھی اسی کی بخشی ہوتی روشنی سے روشن اور روشن گر ہیں، ورنہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں جس سے وہ یہ کرشمہ دکھا سکیں۔

نور کا لفظ علم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس کے بر عکس جہل کو تاریکی اور ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معنی میں بھی کائنات کا نور ہے کہ یہاں حقائق کا علم اور راہ راست کا علم اگر مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔ اس سے فیض حاصل کیے بغیر جہالت کی تاریکی اور نتیجتی ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 63 ▲

مبارک، یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کا حامل۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 64 ▲

یعنی جو کھلے میدان میں یا اوپنی جگہ واقع ہو، جہاں صحیح سے شام تک اس پر دھوپ پڑتی ہو۔ کسی آڑ میں نہ ہو کہ اس پر صرف صحیح کی یا صرف شام کی دھوپ پڑے۔ زیتون کے ایسے درخت کا تیل زیادہ لطیف ہوتا ہے اور زیادہ تیز روشنی دیتا ہے۔ محض شرقی یا محض غربی رخ کے درخت نسبتاً غلیظ تیل دیتے ہیں اور چراغ میں ان کی روشنی ہلکی رہتی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 65 ▲

اس تمثیل میں چراغ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اور طاق سے کائنات کو تشبیہ دی گئی ہے، اور فانوس سے مراد وہ پرده ہے جس میں حضرت حق نے اپنے آپ کو نگاہِ خلق سے چھپا رکھا ہے۔ گویا یہ پرده فی الحقیقت خفا کا نہیں، شدتِ ظہور کا پرده ہے۔ نگاہِ خلق جو اس کو دیکھنے سے عاجز ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ درمیان میں تاریکی حائل ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ درمیان کا پرده شفاف پر دے سے گزر کر آنے والا نور ایسا شدید اور بسیط اور محیط ہے کہ محدود طاقت رکھنے والی بینائیاں اس کا ادراک کرنے سے عاجز رہ گئی ہیں، یہ کمزور بینائیاں صرف ان محدود روشنیوں کا ادراک کر سکتی ہیں جن کے نادر کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے، جو کبھی زائل ہوتی ہیں اور کبھی پیدا ہو جاتی ہیں، جن کے مقابلے میں کوئی تاریکی موجود ہوتی ہے اور اپنی ضد کے سامنے آ کروہ نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن نور مطلق جس کا کوئی مدعیٰ مخالف نہیں، جو کبھی زائل نہیں ہوتا، جو سدا ایک ہی شان سے ہر طرف چھایا رہتا ہے، اس کا ادراک ان کے بس سے باہر ہے۔

رہایہ مضمون کہ "چراغ ایک ایسے درخت زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جونہ شرقی ہونہ غربی"، تو یہ صرف چراغ کی روشنی کے کمال اور اس کی شدت کا تصور دلانے کے لیے ہے۔ قدیم زمانے میں زیادہ سے زیادہ روشنی روغن زیتوں کے چراغوں سے حاصل کی جاتی تھی، اور ان میں روشن ترین چراغ وہ ہوتا تھا جو بلند اور کھلی جگہ کے درخت سے نکالے ہوئے تیل کا ہو۔ تمثیل میں اس مضمون کا مدعایہ نہیں ہے کہ اللہ کی ذات، جسے چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے، کسی اور چیز سے طاقت (Energy) حاصل کر رہی ہے، بلکہ مقصود یہ کہنا ہے کہ مثال میں معمولی چراغ نہیں بلکہ اس روشن ترین چراغ کا تصور کرو جو تمہارے مشاہدے میں آتا ہے۔ جس طرح ایسا چراغ سارے مکان کو جگمگا دیتا ہے اسی طرح اللہ کی ذات نے ساری کائنات کو بقیعہ نور بنار کھا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "اس کا تیل آپ سے آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے"، اس سے بھی چراغ کی روشنی کے زیادہ سے زیادہ تیز ہونے کا تصور دلانا مقصود ہے۔ یعنی مثال میں اس انتہائی تیز روشنی کے چراغ کا تصور کرو جس میں ایسا لطیف اور ایسا سخت اشتعال پذیر تیل پڑا ہوا ہو۔ یہ تینوں چیزیں، یعنی زیتون، اور اس کا غیر شرقی و غربی ہونا، اور اسکے تیل کا آگ لگے بغیر ہی آپ سے آپ بھڑکا پڑنا، مستقل اجزاء تمثیل نہیں ہیں بلکہ پہلے جزو تمثیل یعنی چراغ کے ضمنی متعلقات ہیں اصل اجزاء تمثیل تین ہیں، چراغ، طاق، اور فانوسِ شفاف۔

آیت کا یہ فقرہ بھی لاکن توجہ ہے کہ "اس کے نور کی مثال ایسی ہے"۔ اس سے وہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے جو "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے" کے الفاظ سے کسی کو ہو سکتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کو "نور" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس کی حقیقت ہی بس "نور" ہونا ہے۔ حقیقت میں تو وہ ایک ذات کامل و اکمل ہے جو صاحب علم، صاحب قدرت، صاحب حکمت وغیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نور بھی ہے۔ لیکن خود اس کو نور محس اس کے کمال نورانیت کی کی وجہ سے کہا گیا ہے جیسے کسی کے کمال فیاضی کا حال بیان کرنے کے لیے اس کو خود فیض کہہ دیا جائے، یا اس کے کمال خوبصورتی کا وصف بیان کرنے کے لیے خود اسی کو حسن کے لفظ سے تعبیر کر دیا جائے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 66

یعنی اگرچہ اللہ کا یہ نور مطلق سارے جہان کو منور کر رہا ہے، مگر اس کا ادراک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ادراک کی توفیق، اور اس کے فیض سے مستفیض ہونے کی نعمت اللہ ہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ ورنہ جس طرح اندر ہے کے لیے دن اور رات برابر ہیں، اسی طرح بے بصیرت انسان کے لیے بجلی اور سورج اور چاند اور تاروں کی روشنی تو روشنی ہے مگر اللہ کا نور اس کو سمجھائی نہیں دیتا۔ اس پہلو سے اس بد نصیب کے لیے کائنات میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ آنکھوں کا اندر ہا اپنے پاس کی چیز نہیں دیکھ سکتا، یہاں تک

کہ جب اس سے ٹکر اکر چوٹ کھاتا ہے تب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ چیز یہاں موجود تھی۔ اسی طرح بصیرت کا اندھا ان حقیقوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو عین اس کے پہلو میں اللہ کے نور سے جگ گار ہی ہوں۔ اسے ان کا پتہ صرف اس وقت چلتا ہے جب وہ ان سے ٹکر اکر اپنی شامت میں گرفتار ہو چکا ہوتا ہے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 67

اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جانتا ہے کس حقیقت کو کس مثال سے بہترین طریقہ پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جانتا ہے کون اس نعمت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔ جو شخص نور حق کا طالب ہی نہ ہو اور ہمہ تن اپنی دنیوی اغراض ہی میں گم اور مادی لذتوں اور منفعتوں ہی کی جستجو میں منہمک ہو، اسے زبردستی نور حق دکھانے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس عطیے کا مستحق تو وہی ہے جسے اللہ جانتا ہے کہ وہ اس کا طالب اور مخلص طالب ہے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 68

بعض مفسرین نے ان "گھروں" سے مراد مساجدی ہیں، اور ان کو بلند کرنے سے مراد ان کو تعمیر کرنا اور ان کی تعظیم و تکریم کرنا لیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین ان سے مراد اہل ایمان کے گھر لیتے ہیں اور انہیں بلند کرنے کا مطلب ان کے نزدیک انہیں اخلاقی حیثیت سے بلند کرنا ہے۔ "ان میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے" یہ الفاظ بظاہر مسجد والی تفسیر کے زیادہ مؤید نظر آتے ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری تفسیر کے بھی اتنے ہی مؤید ہیں جتنے پہلی تفسیر کے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی شریعت کہانت زدہ مذاہب کی طرح عبادت کو صرف معبدوں تک ہی محدود نہیں رکھتے جہاں کا ہن یا پوچاری طبقے کے کسی فرد کی پیشوائی کے بغیر مراسم بندگی ادا نہیں کیے جاسکتے، بلکہ یہاں مسجد کی طرح گھر بھی عبادت گاہ ہے اور ہر شخص اپنا پروہت آپ ہے۔ چونکہ اس سورے میں تمام تر خانگی زندگی کو اعلیٰ وارفع بنانے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں، اس لیے دوسری تفسیر ہم کو موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اگرچہ پہلی

تفسیر کو بھی رد کر دینے کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ کیا مضافات ہے اگر اس سے مراد مومنوں کے گھر اور ان کی مسجدیں، دونوں ہی ہوں۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 69

یہاں ان صفات کی تشریح کردی گئی جو اللہ کے نور مطلق کا ادراک کرنے اور اس کے فیض سے بہرہ مندر ہونے کے لیے درکار ہیں۔ اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے کہ یوں ہی جسے چاہا مالا مال کر دیا اور جسے چاہا دھنکار دیا۔ وہ جسے دیتا ہے کچھ دیکھ کر ہی دیتا ہے، اور نعمت حق دینے کے معاملے میں جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس کی محبت، اور اس سے دلچسپی، اور اس کا خوف، اور اس کے انعام کی طلب، اور اس کے غضب سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔ وہ دنیا پرستی میں گم نہیں ہے۔ بلکہ ساری مصروفیتوں کے باوجود اس کے دل میں اپنے خدا کی یاد بسی رہتی ہے۔ وہ پستیوں میں پڑا نہیں رہنا چاہتا بلکہ اس بلندی کو عملًا اختیار کرتا ہے جس کی طرف اس کا مالک اس کی رہنمائی کرے۔ وہ اسی حیات چندر روزہ کے فائدوں کا طلبگار نہیں ہے بلکہ اس کی نگاہ آخرت کی ابدی زندگی پر جمی ہوئی ہے۔ یہی کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آدمی کو اللہ کے نور سے بہرہ اندوڑ ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب اللہ دینے پر آتا ہے تو اتنا دیتا ہے کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسرا بات ہے، ورنہ اس کی دین کے لیے کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 70

یعنی اس تعلیم حق کو بصدق دل قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اللہ کی طرف سے اس کے پیغمبروں نے دی ہے اور جو اس وقت اللہ کے پیغمبر سیدنا محمد ﷺ دے رہے تھے۔ اوپر کی آیات خود بتا رہی ہیں کہ اللہ کا نور پانے والوں سے مراد سچ اور صالح مومن ہیں۔ اس لیے اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی حالت بتائی جا رہی ہے جو اس نور کو پانے کے اصلی اور واحد ذریعے، یعنی رسول ہی کامانے اور اس کا اتباع کرنے سے انکار کر دیں، خواہ دل سے انکار کریں اور محض زبان سے اقراری ہوں یا دل اور زبان دونوں ہی سے انکاری ہوں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 71 ▲

اس مثال میں ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو کفر و نفاق کے باوجود ظاہر کچھ نیک اعمال بھی کرتے ہوں اور فی الجملہ آخرت کے بھی قائل ہوں، اور اس خیال خام میں مبتلا ہوں کہ ایمان صادق اور صفات اہل ایمان، اور اطاعت و اتباع رسول ﷺ کے بغیر ان کے یہ اعمال آخرت میں ان کے لیے کچھ مفید ہوں گے۔ مثال کے پیرا یے میں ان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے جن ظاہری و نمائشی اعمال خیر سے آخرت میں فائدے کی امید رکھتے ہو ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ ریاستان میں چمکتی ہوئی ریت کو دور سے دیکھ کر جس طرح پیاسا یہ سمجھتا ہے کہ پانی کا ایک تالاب موجود مار رہا ہے اور منہ اٹھائے اس کی طرف پیاس بچانے کی امید لیے ہوئے دوڑتا چلا جاتا ہے، اسی طرح تم ان اعمال کے جھوٹے بھروسے پر موت کی منزل کا سفر طے کرتے چلے جا رہے ہو۔ مگر جس طرح سراب کی طرف دوڑنے والا جب اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اسے تالاب نظر آ رہا تھا تو کچھ نہیں پاتا، اسی طرح جب تم منزل موت میں داخل ہو جاؤ گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس کا تم کوئی فائدہ اٹھا سکو، بلکہ اس کے بر عکس اللہ تمہارے کفر و نفاق کا، اور ان بد اعمالیوں کا جو تم ان نمائشی نیکیوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ حساب لینے اور پورا پورا بدله دینے کے لیے موجود ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 72 ▲

اس مثال میں تمام کفار و منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے جن میں نمائشی نیکیاں کرنے والے بھی شامل ہیں۔ ان سب کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی قطعی اور کامل جہالت کی حالت میں بسر کر رہے ہیں، خواہ وہ دنیا کی اصطلاحوں میں علامہ دہر اور علوم و فنون کے استاذ الاسم تذہبی کیوں نہ ہوں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی جگہ پھنسا ہوا ہو جہاں مکمل تاریکی ہو، روشنی کی ایک کرن تک نہ پہنچ سکتی ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم اور ہائیڈ رو جن بم اور آواز سے تیز رفتار طیارے، اور چاند تک پہنچنے والی ہوائیاں بنالینے کا

نام علم ہے۔ ان کے نزدیک معاشیات اور مالیات اور قانون اور فلسفے میں مہارت کا نام علم ہے۔ مگر حقیقی علم ایک اور چیز ہے، اور اس کی ان کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اس علم کے اعتبار سے وہ جاہلِ محض ہیں، اور ایک ان پڑھ دیہاتی ذی علم ہے اگر وہ معرفت حق سے بہرہ مند ہو۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 73

یہاں پہنچ کر وہ اصل مذاکھوں دیا گیا ہے جس کی تمہید **اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ** کے مضمون سے اٹھائی گئی تھی۔ جب کائنات میں کوئی نور درحقیقت اللہ کے نور کے سوانحیں ہے، اور سارا ظہور حقائق اسی نور کی بدولت ہو رہا ہے، تو جو شخص اللہ سے نور نہ پائے وہ اگر کامل تاریکی میں مبتلا نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ کہیں اور تورو شنی موجود ہی نہیں ہے کہ اس سے ایک کرن بھی وہ پاسکے۔

٦٤ رکوٰ

الَّمْ تَرَأَنَ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْطَّيْرُ صَافِتٌ كُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَ
تَسْبِيْحَهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٢٣﴾ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ

الَّمْ تَرَأَنَ اللَّهَ يُرْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ
خِلْلِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاوَاتِ مِنْ جَبَائِلٍ فِيهَا مِنْ بَرِدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ
مَنْ يَشَاءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقَهُ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ﴿٢٤﴾ يُقَلِّبُ اللَّهُ الْيَوْلَ وَالنَّهَارَ إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَعِبْرَةً لَا وِلِيَ الْأَبْصَارِ ﴿٢٥﴾ وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِنْ مَاءٍ فِينَهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَى بَطْنِهِ وَ
مِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَى أَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾ لَقَدْ أَنْزَلْنَا آيَتِ مُبَيِّنَتٍ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطِ
مُسْتَقِيمٍ ﴿٢٧﴾ وَيَقُولُونَ أَمَنَّا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَأَطْعَنَا ثُمَّ يَتَوَلِّ فَرِيقٌ مِنْهُمْ مِنْ بَعْدِ
ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٨﴾ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحُكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ
مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٢٩﴾ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمْ الْحُقْقُ يَا تُوَا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿٣٠﴾ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرْضٌ أَمْ
أَرْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحْيِفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٣١﴾

۶ رکوٰت

74 کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اُڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے، اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنادیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹکتے چلتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے، اُن پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں، **75** اولے بر ساتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچایتا ہے۔ اُس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ رات اور دن کا الٹ پھیرو ہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے۔

اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا، کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دی ہیں، آگے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اللہ ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول ﷺ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ **76** جب ان کو بلا یا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف، تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے **77** تو ان میں

سے ایک فریق کتر اجا تا ہے۔ **78** البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آ جاتے ہیں۔ **79** کیا ان کے دلوں کو منافقت کا روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔ **80**

سورة النور حاشیہ نمبر: 74 ▲

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے مگر اس نور کے ادراک کی توفیق صرف صالح اہل ایمان، ہی کو نصیب ہوتی ہے، باقی سب لوگ اس نور کا مل و شامل کے محیط ہوتے ہوئے بھی انہوں کی طرح تاریکی میں بھکلتے رہتے ہیں۔ اب اس نور کی طرف رہنمائی کرنے والے بے شمار نشانات میں سے صرف چند کو بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے کہ دل کی آنکھیں کھول کر کوئی انہیں دیکھے تو ہر وقت ہر طرف اللہ کو کام کرتے دیکھ سکتا ہے۔ مگر جو دل کے اندر ہے ہیں وہ اپنے سر کے دیدے پھاڑ پھاڑ کر بھی دیکھتے ہیں تو انہیں بیولو جی اور زوالو جی اور طرح طرح کی دوسری لوجیاں تو اچھی خاصی کام کرتی نظر آتی ہیں مگر اللہ کہیں کام کرتا نظر نہیں آتا۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 75 ▲

اس سے مراد سردی سے جمے ہوئے بادل بھی ہو سکتے ہیں جنہیں مجازاً آسمان کے پہاڑ کہا گیا ہو۔ اور زمین کے پہاڑ بھی ہو سکتے ہیں جو آسمان میں بلند ہیں، جن کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کے اثر سے بسا اوقات ہوا اتنی سرد ہو جاتی ہے کہ بادلوں میں انجماد پیدا ہونے لگتا ہے اور الوں کی شکل میں بارش ہونے لگتی ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 76 ▲

یعنی اطاعت سے رو گردانی ان کے دعائے ایمان کی خود تردید کر دیتی ہے، اور اس حرکت سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ انہوں نے جھوٹ کہا جب کہا کہ ہم ایمان لائے اور ہم نے اطاعت قبول کی۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 77 ▲

یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول ﷺ کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ رسول کی طرف بلا یا جانا صرف رسول ہی کی طرف بلا یا جانا نہیں بلکہ اللہ اور رسول دونوں کی طرف بلا یا جانا ہے۔ نیز اس آیت اور اوپر والی آیت سے یہ بات بلا کسی اشتباہ کے بالکل واضح ہو جاتی ہے اللہ اور رسول کی اطاعت کے بغیر ایمان کا دعویٰ بے معنی ہے اور اطاعت خدا اور رسول کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلمان بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم اس قانون کے آگے جھک جائیں جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا ہے۔ یہ طرز عمل اگر وہ اختیار نہیں کرتے تو ان کا دعویٰ ایمان ایک منافقانہ دعویٰ ہے۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نساء آیات 59-61۔ مع حواشی 89 تا 92)۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 78 ▲

واضح رہے کہ یہ معاملہ صرف نبی ﷺ کی زندگی، ہی کے لیے نہ تھا، بلکہ آپ ﷺ کے بعد جو بھی اسلامی حکومت کے منصب قضا پر ہو اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق فیصلے کرے اس کی عدالت کا سمن دراصل اللہ اور رسول کی عدالت کا سمن ہے، اور اس سے منه موڑنے والا در حقیقت اس سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول سے منه موڑنے والا ہے۔ اس مضمون کی یہ تشریح خود نبی ﷺ سے ایک مرسل حدیث میں مروی ہے جسے حسن بصری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ من دعى الى حاكم من حكام المسلمين فلم يجب فهو ظالم لاحق له جو شخص مسلمانوں کے حکام عدالت میں سے کسی حاکم کی طرف بلا یا جائے اور وہ حاضر نہ ہو تو وہ ظالم ہے۔ اس کا کوئی حق نہیں ہے" (احکام القرآن جصاص ج 3، ص 405)۔ بالفاظ دیگر ایسا شخص سزا کا بھی مستحق ہے، اور مزید برال اس کا بھی مستحق ہے کہ اسے بر سر باطل فرض کر کے اس کے خلاف یک طرفہ فیصلہ دے دیا جائے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 79 ▲

یہ آیت اس حقیقت کو صاف صاف کھول کر بیان کر رہی ہے کہ جو شخص شریعت کی مفید مطلب باتوں کو خوشی سے لپک کر لے لے، مگر جو کچھ خدا کی شریعت میں اس کی اغراض و خواہشات کے خلاف ہوا سے رد کر دے، اور اس کے مقابلے میں دنیا کے دوسرے قوانین کو ترجیح دے وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے، کیونکہ وہ ایمان خدا اور رسول پر نہیں، اپنی اغراض اور خواہشات پر رکھتا ہے۔ اس رویے کے ساتھ خدا کی شریعت کے کسی جز کو اگر وہ مان بھی رہا ہے تو خدا کی نگاہ میں اس طرح کے مانے کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 80 ▲

یعنی اس طرز عمل کی تین ہی وجہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی سرے سے ایمان، ہی نہ لایا ہو اور منافقانہ طریقے پر محض دھوکا دینے اور مسلم معاشرے میں شرکت کانا جائز فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمان ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ایمان لے آنے کے باوجود اس امر میں ابھی تک شک ہو کہ رسول خدا کا رسول ہے یا نہیں، اور قرآن خدا کی کتاب ہے یا نہیں، آخرت واقعی آنے والی ہے بھی یا یہ محض ایک افسانہ تراشیدہ ہے، بلکہ خدا بھی حقیقت میں موجود ہے یا یہ بھی ایک خیال ہے جو کسی مصلحت سے گھڑ لیا گیا ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان کر بھی ان سے ظلم کا اندیشہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ خدا کی کتاب نے فلاں حکم دے کر تو ہمیں مصیبت میں ڈال دیا اور خدا کے رسول کا فلاں ارشاد یا فلاں طریقہ تو ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو ایسے لوگوں کے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس طرح کے خیالات رکھ کر جو شخص مسلمانوں میں شامل ہوتا ہے، ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، اور مسلم معاشرے کا ایک رکن بن کر مختلف قسم کے ناجائز فائدے اس معاشرے سے حاصل کرتا ہے، وہ بہت بڑا دغabaز، خائن اور جعل ساز ہے۔ وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتا ہے کہ اسے شب و روز کے جھوٹ سے

ذلیل ترین خصائص کا پیکر بناتا چلا جاتا ہے۔ اور ان مسلمانوں پر بھی ظلم کرتا ہے جو اس کے ظاہری کلمہ شہادت پر اعتماد کر کے اسے اپنی ملت کا ایک جزمان لیتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ طرح طرح کے معاشرتی، تمنی، سیاسی اور اخلاقی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔

رکوٰء <

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحُكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطْعَنَا طَوْأِيلِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٤١﴾ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَآيِزُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لِيَخْرُجُنَّ طَوْأِيلَ لَا تُقْسِمُوا طَاعَةً مَعْرُوفَةً طَوْأِيلَ خَيْرٍ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلُّو فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ طَوْأِيلَ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا طَوْأِيلَ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمِيْنُ ﴿٤٤﴾ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ أَمْنَوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ طَوْأِيلَ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ طَوْأِيلَ وَلَيَمْكِنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا طَوْأِيلَ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا طَوْأِيلَ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَسِقُونَ ﴿٤٥﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الزَّكُوَةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ طَوْأِيلَ لَعَلَّكُمْ تُرَحَّمُونَ ﴿٤٦﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِيْنَ فِي الْأَرْضِ طَوْأِيلَ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ طَوْأِيلَ لِيَسَّ اللَّهِ صِيرُوتُهُ ﴿٤٧﴾

رکوء >

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بُلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے شنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاج پانے والے ہیں، اور کامیاب و ہی ہیں جو اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔

یہ ﴿منافق﴾ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ”آپ حکم دیں تو ہم گھروں سے نکل کھڑے ہوں۔“ ان سے کہو ”قسمیں نہ کھاؤ، تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے 81، تمہارے کرتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔ 82“ کہو ”اللہ کے مطبع بنو اور رسول ﷺ کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول ﷺ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اُس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اُس کے ذمہ دار تم۔ اُس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے۔ ورنہ رسول ﷺ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔“

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُل لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنیا چکا ہے، ان کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی ﴿موجودہ﴾ حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ 83 اور جو اس کے بعد گفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ جو لوگ گفر کر رہے ہیں ان کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ ان کاٹھ کانا دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی بُراٹھ کانا ہے۔ ۶۷

سورة النور حاشیہ نمبر: 81

دوسرامطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان سے جو اطاعت مطلوب ہے وہ معروف اور معلوم قسم کی اطاعت ہے جو ہر شبہ سے بالاتر ہو، نہ کہ وہ اطاعت جس کا یقین دلانے کے لیے فتیمیں کھانے کی ضرورت پڑے اور پھر بھی یقین نہ آسکے۔ جو لوگ حقیقت میں مطیع فرمان ہوتے ہیں ان کا رویہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہوتا۔ ہر شخص ان کے طرز عمل کو دیکھ کر محسوس کر لیتا ہے کہ یہ اطاعت گزار لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ اسے رفع کرنے کے لیے فتیمیں کھانے کی ضرورت پیش آئے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 82

یعنی یہ فریب کاریاں مخلوق کے مقابلے میں تو شاید چل بھی جائیں مگر خدا کے مقابلے میں کیسے چل سکتی ہیں جو کھلے اور چھپے سب حالات، بلکہ دلوں کے مخفی ارادے اور خیالات تک سے واقف ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 83

جبیسا کہ اس سلسلہ کلام کے آغاز میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، اس ارشاد سے مقصود منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں، اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں، اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعا لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے۔ لہذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔

بعض لوگ خلافت کو محض حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و تمکن کے معنی میں لے لیتے ہیں، پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے وہ مومن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیر و

اور بندگی حق پر عامل اور شرک سے مجبوب ہے، اور اس پر مزید ستم یہ ڈھانتے ہیں کہ اپنے اس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے ایمان، صلاح، دین حق، عبادت الہی اور شرک، ہر چیز کا مفہوم بدل کرو وہ کچھ بنادالتے ہیں جو ان کے اس نظریے کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی ہے۔ اس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنی پہنادیے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو مسخ کر ڈالتے ہیں اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لا محالہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصدق بن جاتے ہیں جنہوں نے کبھی دنیا میں غلبہ و تمکن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں، خواہ وہ خدا، وحی، رسالت، آخرت ہر چیز کے منکر ہوں اور فسق و فجور کی ان تمام آلاتوں میں بری طرح لتھڑے ہوئے ہوں جنہیں قرآن نے کبائر قرار دیا ہے، جیسے سود، زنا، شراب اور جوا۔ اب اگر یہ سب لوگ مومن صالح ہیں اور اسی لیے خلافت کے منصب عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنی قوانین طبیعی کو ماننے، اور صلاح کے معنی ان قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علوم طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت و حرفت اور تجارت و سیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی کا مطلب پھر اس کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے کہ ان قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے جو انفرادی اور اجتماعی سعی و جہد کی کامیابی کے لیے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں؟ اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ ان مفید قواعد و ضوابط کے ساتھ کوئی شخص یا قوم کچھ نقصان دہ طریقے بھی اختیار کر لے؟ مگر کیا کوئی شخص جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی، ایمان اور عمل صالح اور دین حق اور عبادت الہی اور توحید اور شرک کے یہی معنی ہیں؟ یہ معنی یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی

کہیں سے لے کر اس کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھال لیا ہو، یا پھر وہ شخص یہ حرکت کر سکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے ان سب آیات کو اپنے زعم میں سراسر لغو اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو جن میں اللہ تعالیٰ کو واحد رب اور الہ، اور اس کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعہ ہدایت، اور اس کے مبوعث کردہ ہر پیغمبر کو حتی طور پر واجب الاطاعت رہنمای تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر ایک دوسری زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اس زندگی میں اپنی جواب دہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر محض اس دنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے وہ فلاج سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں ان مضامین کو اس قدر کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے اور ایسے صریح و صاف الفاظ میں بار بار دہرا یا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمانداری کے ساتھ پڑھنے والا کوئی شخص کبھی ان غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیت استخلاف کے یہ نئے مفسرین مبتلا ہوئے ہیں۔ حالانکہ لفظ خلافت و استخلاف کے جس معنی پر انہوں نے یہ ساری عمارت کھڑی کی ہے وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے، قرآن کا جاننے والا کوئی شخص اس آیت میں وہ معنی کبھی نہیں لے سکتا۔

قرآن دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ہر جگہ سیاق و سبق سے پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنی میں یہ لفظ بولا گیا ہے :

اس کے ایک معنی ہیں "خدا کے دیے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا" اس معنی میں پوری اولاد آدم زمین میں خلیفہ ہے۔ دوسرے معنی ہیں "خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امر شرعی (نہ کہ محض امر تکوینی) کے تحت اختیارات خلافت کو استعمال کرنا"۔ اس معنی میں صرف مومن صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے

، کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے۔ اور اس کے برعکس کافروں اس قبیلے کے خلیفہ نہیں بلکہ بااغی ہے، کیونکہ وہ مالک کے ملک میں اس کے دیے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔ تیسرے معنی ہیں "ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا"۔ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنی "نیابت" سے مانخواز ہیں، اور یہ آخری معنی خلافت بمعنی "جاشینی" سے مانخواز۔ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنی لغت عرب میں معلوم و معروف ہیں۔

اب جو شخص بھی یہاں اس سیاق و سبق میں آیت استخلاف کو پڑھے گا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اللہ کے امر شرعی کے مطابق (نہ کہ محض قوانین فطرت کے مطابق) اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لیے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عمل صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں اسی لیے قیام خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کا پسند کردہ دین، یعنی اسلام، مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔ اور اسی لیے اس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جا رہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس وعدے کو یہاں سے اٹھا کر بین الا قوامی چورا ہے پر لے پہنچنا اور امریکہ سے لے کر روس تک جس کی کبریائی کا ڈنکا بھی دنیا میں نج رہا ہو اس کے حضور اسے نذر کر دینا جہالت کی طغيانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ سب طاقتیں بھی اگر خلافت کے منصب عالی پر سرفراز ہیں تو آخر فرعون اور نمرود ہی نے کیا قصور کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لعنت کا مستحق قرار دیا؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، الانبیاء، حاشیہ 99)۔

اس جگہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو توبالا واسطہ پہنچتا ہے۔ بلا واسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی ﷺ کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالت خوف طاری تھی اور دین اسلام نے ابھی ججاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالت خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں، کرۂ زمین میں جنم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومن صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نبیح البلاغہ میں سیدنا علیؑ کَرَمُ اللَّهُ وَجْهَهُ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

" اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت و قلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اللہ کا لشکر ہے جس کی اس نے تائید و نصرت فرمائی، یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اللہ خود فرمآ چکا ہے وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ أَمْنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصِّلَاةَ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ اللہ اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی ضرور مدد کرے گا۔ اسلام میں قیم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتہ کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹنے ہی موتی بکھر جاتے ہیں اور نظم در ہم بر ہم ہو جاتا ہے۔ اور پر اگنڈہ ہو جانے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں۔ مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قوی بنادیا ہے۔ آپ یہاں قطب

بن کر جمے بیٹھے رہیں اور عرب کی جگلی کو اپنے گرد گھماتے رہیں اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں۔ ورنہ آپ اگر ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا اور نوبت یہ آجائے گی کہ آپ کو سامنے کے دشمنوں کی بہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہو گی۔ اور ادھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظر جمادیں گے کہ یہ عرب کی جڑ ہے، اسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے، اس لیے وہ سارا زور آپ کو ختم کر دینے پر لگادیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہل عجم بڑی کثیر تعداد میں امنڈ آئے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہم جوان سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرت تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں، بلکہ اللہ کی تائید و نصرت ہی نے آج تک ہمیں کامیاب کرایا ہے"۔

دیکھنے والا خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس تقریر میں جناب امیر کس کو آیت استخلاف کا مصدقہ ٹھہرا رہے ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 84 ▲

کفر سے مراد یہاں کفر ان نعمت بھی ہو سکتا ہے اور انکار حق بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کے مصدقہ وہ لوگ ہوں گے جو نعمت خلافت پانے کے بعد طریق حق سے ہٹ جائیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کے مصدقہ منافقین ہوں گے جو اللہ کا یہ وعدہ سن لینے کے بعد بھی اپنی منافقانہ روشن نہ چھوڑیں۔

يَبْيَّنُ اللَّهُ تَكُونُ الْأَيْتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١١﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنُكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلْمَ
 مِنْكُمْ ثَلَثَ مَرَّاتٍ مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَ حِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ وَ مِنْ بَعْدِ
 صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَثُ عَوْرَاتٍ لَكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوْفُونَ
 عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ تَكُونُ الْأَيْتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٨﴾ وَإِذَا بَلَغَ
 الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلْمَ فَلَيَسْتَأْذِنُوَا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ
 تَكُونُ الْأَيْتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ
 عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَهُنَّ وَاللَّهُ
 سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٦٠﴾ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى
 أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهِتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ
 بُيُوتِ أَخْوَتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
 خَلِيلِكُمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ مَفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ
 أَشْتَاتًا فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُبَرَّكَةً طَيِّبَةً كَذَلِكَ
 يُبَيِّنُ اللَّهُ تَكُونُ الْأَيْتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٢﴾

رکو ۶۸

۸۵ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، لازم ہے کہ تمہارے مملوک **۸۶** اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں **۸۷**، تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے، اور دوپہر کو جبکہ تم کپڑے اُتار کر رکھ دیتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لیے پردے کے وقت ہیں۔ **۸۸** ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر، **۸۹** تمہیں ایک ڈوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔ **۹۰** اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے، اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تمہارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں **۹۱** تو چاہیے کہ اُسی طرح اجازت لیکر آیا کریں جس طرح ان کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں۔ اس طرح اللہ اپنی آیات تمہارے سامنے کھولتا ہے، اور وہ علیم و حکیم ہے۔

اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں **۹۲**، نکاح کی امیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اُتار کر رکھ دیں **۹۳** تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ **۹۴** تاہم وہ بھی حیاداری ہی بر تیں تو ان کے حق میں اچھا ہے، اور اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔

کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا، یا لنگڑا، یا مریض **۹۵** کسی کے گھر سے کھالے ہو اور نہ تمہارے اوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماں نانی کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنے خالاؤں کے گھروں سے، یا ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہاری سپردگی میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔ **۹۵** اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم

لوگ مل کر کھاویا الگ الگ۔ **96** البته جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، دعائے خیر، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو گے۔ ۸۶

سورة النور حاشیہ نمبر: 85

یہاں سے پھر احکام معاشرت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعید نہیں کہ سورہ نور کا یہ حصہ اوپر کی تقریر کے کچھ مدت بعد نازل ہوا ہو۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 86

جمہور مفسرین و فقہاء کے نزدیک اس سے مراد لوندیاں اور غلام دونوں ہیں، کیونکہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ابن عمر اور مجاہد اس آیت میں مملوکوں سے مراد صرف غلام لیتے ہیں اور لوندیوں کو اس سے مستثنی کرتے ہیں۔ حالانکہ آگے جو حکم بیان کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تخلیہ کے اوقات میں جس طرح خود اپنے بچوں کا اچانک آجانا مناسب نہیں اسی طرح خادمہ کا بھی آجانا غیر مناسب ہے۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس آیت کا حکم بالغ و نابالغ دونوں قسم کے مملوکوں کے لیے عام ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 87

دوسراترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالغوں کا ساخواب دیکھنے کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔ اسی سے فقہاء نے لڑکوں کے معاملے میں احتلام کو بلوغ کا آغاز مانا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن جو ترجمہ ہم نے متن میں اختیار کیا ہے وہ اس بنابر قابل ترجیح ہے کہ یہ حکم لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے لیے ہے، اور احتلام کو علامت بلوغ قرار دینے کے بعد حکم صرف لڑکوں کے لیے خاص ہو جاتا ہے، کیونکہ لڑکی کے معاملہ میں ایام ماہواری کا آغاز علامت بلوغ ہے نہ کہ احتلام۔ لہذا ہمارے نزدیک حکم کا مشایہ ہے کہ جب تک گھر کے

پچھے اس عمر کو نہ پہنچیں جس میں ان کے اندر صرف شعور بیدار ہوا کرتا ہے، اور اس قاعدے کی پابندی کریں، اور جب اس عمر کو پہنچ جائیں تو پھر ان کے لیے وہ حکم ہے جو آگے آ رہا ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 88 ▲

اصل میں لفظ **عَوْرَتٍ** استعمال ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "یہ تین وقت تمہارے لیے عورات ہیں"۔ عورت اردو میں تو صرف اُناث کے لیے بولا جاتا ہے مگر عربی میں اس کے معنی خلل اور خطرے کی جگہ کے ہیں، اور اس چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کا کھل جانا آدمی کے لیے باعث شرم ہو، یا جس کا ظاہر ہو جانا اس کو ناگوار ہو، نیز اس معنی میں بھی یہ مستعمل ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ ہو۔ یہ سب معنی باہم قریبی مناسبت رکھتے ہیں اور آیت کے مفہوم میں کسی نہ کسی حد تک سبھی شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اوقات میں تم لوگ تنہا، یا اپنی بیویوں کے ساتھ ایسی حالتوں میں ہوتے ہو جن میں گھر کے پھوٹ اور خادموں کا اچانک تمہارے پاس آ جانا مناسب نہیں ہے، لہذا ان کو یہ ہدایت کرو کہ ان تین وقتوں میں جب وہ تمہاری خلوت کی جگہ آنے لگیں تو پہلے اجازت لے لیا کریں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 89 ▲

یعنی ان تین وقتوں کے سواد و سرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے مملوک ہر وقت عورتوں اور مردوں کے پاس ان کے کمرے میں یا ان کے تخلیے کی جگہ میں بلا اجازت آ سکتے ہیں۔ اس صورت میں اگر تم کسی نامناسب حالت میں ہو اور وہ بلا اجازت آ جائیں تو تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ پھر یہ تمہاری اپنی حماقت ہو گی کہ کام کا جگ کے اوقات میں اپنے آپ کو ایسی نامناسب حالت میں رکھو۔ البتہ اگر تخلیے کے مذکورہ بالا تین اوقات میں وہ بلا اجازت آ جائیں، تو وہ قصور وار ہیں اگر تمہاری تربیت و تعلیم کے باوجود یہ حرکت کریں، ورنہ تم خود گناہ گار ہو اگر تم نے اپنے پھوٹ اور مملوکوں کو یہ تہذیب نہیں سکھائی۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 90 ▲

یہ وجہ ہے اس اجازت عام کی جو تین اوقات مذکورہ کے سوا دوسرے تمام اوقات میں بچوں اور مملوکوں کو بلا اجازت آنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس سے اصول فقہ کے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں، اور ہر حکم کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے، خواہ وہ بیان کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 91 ▲

یعنی بالغ ہو جائیں۔ جیسا کہ اوپر حاشیہ نمبر 87 میں بیان کیا جا چکا ہے لڑکوں کے معاملے میں احتلام اور لڑکیوں کے معاملے میں ایام ماہواری کا آغاز علامت بلوغ ہے۔ لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں کسی وجہ سے دیر تک ان جسمانی تغیرات سے خالی رہ جائیں ان کے معاملہ میں فقهاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی[ؒ]، امام ابو یوسف، امام محمد، اور امام احمد کے نزدیک اس صورت میں 15 برس کے لڑکے اور لڑکی کو بالغ سمجھا جائے گا، اور امام ابو حنیفہ[ؒ] کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ لیکن امام اعظم کا مشہور قول یہ ہے کہ اس صورت میں 17 برس کی لڑکی اور 18 برس کے لڑکے کو بالغ قرار دیا جائے گا۔ یہ دونوں قول کسی نص پر نہیں بلکہ فقیہانہ اجتہاد پر مبنی ہیں، لہذا ضروری نہیں ہے کہ تمام دنیا میں ہمیشہ 15 یا 18 برس کی عمر ہی کو غیر محتمل لڑکوں اور غیر حاضر لڑکیوں کے معاملے میں حد بلوغ مانا جائے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں، اور مختلف زمانوں میں جسمانی نشوونما کے حالات مختلف ہو اکرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ عموماً کسی ملک میں جن عرونوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو احتلام اور ایام ماہواری ہونے شروع ہوتے ہوں ان کا اوسط فرق نکال لیا جائے، اور پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی غیر معمولی وجہ سے یہ علامات اپنے معتاد وقت پر نہ ظاہر ہوں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ معتاد عمر پر اس اوسط کا اضافہ کر کے اسے بلوغ کی عمر قرار دے دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں بالعموم کم سے کم 12 اور زیادہ سے زیادہ 15 برس کے لڑکے کو احتلام ہوا کرتا ہو، تو اوسط فرق ڈیڑھ سال ہو گا، اور غیر معمولی قسم کے لڑکوں کے لیے ہم ساڑھے سولہ برس کی عمر کو سن بلوغ قرار دے سکیں

گے۔ اسی قاعدے پر مختلف ممالک کے اہل قانون اپنے ہاں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک حد مقرر کر سکتے ہیں۔

15 برس کی حد کے حق میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، اور وہ ابن عمرؓ کی یہ روایت ہے کہ میں 14 سال کا تھا جب غزوہ احمد کے موقع پر نبی ﷺ کے سامنے پیش ہوا اور آپ ﷺ نے مجھے شریک جنگ ہونے اجازت نہ دی پھر غزوہ خندق کے موقع پر، جبکہ میں 15 سال کا تھا، مجھے دوبارہ پیش کیا گیا اور آپ ﷺ نے مجھ کو اجازت دے دی (صحاح سنت و مسند احمد)۔ لیکن یہ روایت دو وجہ سے قابل استدلال نہیں ہے۔ اول یہ کہ غزوہ احمد شوال 3ھ کا واقعہ ہے اور غزوہ خندق بقول محمد بن اسحاق شوال 5ھ میں اور بقول ابن سعد ذی القعدہ 5 میں پیش آیا۔ دونوں واقعات کے درمیان پورے دو سال یا اس سے زیادہ کا فرق ہے۔ اب اگر غزوہ احمد کے زمانے میں ابن عمر 14 سال کے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ غزوہ خندق کے زمانے میں وہ صرف 15 سال کے ہوں؟ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے 12 سال 11 مہینے کی عمر کو 14 سال، اور 15 برس 11 مہینے کی عمر کا 15 سال کہہ دیا ہو۔ دوسرا وجہ یہ ہے کہ لڑائی کے لیے بالغ ہونا اور چیز ہے اور معاشرتی معاملات میں قانوناً بالغ ہونا اور چیز۔ ان دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک کو دوسرے کے لیے دلیل بنایا جاسکے۔ لہذا صحیح یہ ہے کہ غیر مختار لڑکے کے لیے 15 برس کی عمر مقرر کرنا ایک قیاسی و اجتہادی حکم ہے، کوئی منصوص حکم نہیں ہے۔

▲ سورۃ النور حاشیہ نمبر: 92

اصل میں لفظ **قَوْاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ** کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی "عورتوں میں سے جو بیٹھ چکی ہوں" یا "بیٹھی ہوئی عورتیں"۔ اس سے مراد ہے سن یا س، یعنی عورت کا اس عمر کو پہنچ جانا جس میں وہ اولاد پیدا

کرنے کے قابل نہ رہے، اس کی اپنی خواہشات بھی مر جکی ہوں اس کو دیکھ کر مردوں میں بھی کوئی صنفی جذبہ نہ پیدا ہو سکتا ہو۔ اسی معنی کی طرف بعد کافقرہ اشارہ کر رہا ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 93 ▲

اصل الفاظ ہیں **يَضْعَنَ ثِيَابَهُنَّ**، "اپنے کپڑے اتار دیں"۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد سارے کپڑے اتار کر برہنہ ہو جانا تو نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تمام فقهاء اور مفسرین نے بالاتفاق اس سے مراد وہ چادریں لی ہیں جن سے زینت کو چھپانے کا حکم سوراحزاب کی آیت **يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيِّهِنَّ** میں دیا گیا تھا۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 94 ▲

اصل الفاظ ہیں **غَيْرَ مُتَبَرِّجٍ بِزِينَةٍ** زینت کے ساتھ تبرُّج کرنے والی نہ ہوں"۔ **تَبَرُّج** کے معنی ہیں اظہار و نمائش کے۔ بارج اس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں جس پر چھٹ نہ ہو۔ اسی معنی میں عورت کے لیے یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جبکہ وہ مردوں کے سامنے اپنے حسن اور اپنی آرائش کا اظہار کرے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ چادر اتار دینے کی یہ اجازت ان بوڑھی عورتوں کو دی جائی ہی ہے جن کے اندر بن ٹھن کر رہنے کا شوق باقی نہ رہا ہو اور جن کے صنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں۔ لیکن اگر اس آگ میں کوئی چنگاری ابھی باقی ہو اور وہ نمائش زینت کی شکل اختیار کر رہی ہو تو پھر اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 95 ▲

اس آیت کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اول یہ کہ آیت کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ بیمار، لنگڑے، اندھے اور اسی طرح دوسرا مغذور لوگوں کے بارے میں ہے، اور دوسرا عام لوگوں کے بارے میں۔ دوم یہ کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے اہل عرب کی ذہنیت میں جوز بردست انقلاب واقع ہوا

تحا اس کی وجہ سے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کے معاملے میں ان کی حس انتہائی نازک ہو گئی تھی۔

ابن عباسؓ کے بقول، اللہ تعالیٰ نے جب ان کو حکم دیا کہ **لَا تَأْكُلُوا آمْوَالَكُمْ بِيَنَّكُمْ بِالْبَاطِلِ** (ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ) تو لوگ ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے میں بھی سخت احتیاط برتنے لگے تھے، حتیٰ کہ بالکل قانونی شرطوں کے مطابق صاحب خانہ کی دعوت و اجازت جب تک نہ ہو، وہ سمجھتے تھے کہ کسی عزیز یادوست کے ہاں کھانا بھی ناجائز ہے۔ سوم یہ کہ اس میں اپنے گھروں سے کھانے کا جو ذکر ہے وہ اجازت دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ ذہن نشین کرنے کے لیے ہے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں کھانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاں کھانا، اور نہ ظاہر ہے کہ اپنے گھر سے کھانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ ان تین باتوں کو سمجھ لینے کے بعد آیت کا یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں تک معدود آدمی کا تعلق ہے، وہ اپنی بھوک رفع کرنے کے لیے ہر گھر اور ہر جگہ سے کھاسکتا ہے، اس کی معدودی بجائے خود سارے معاشرے پر اس کا حق قائم کر دیتی ہے۔ اس لیے جہاں سے بھی اس کو کھانے کے لیے ملے وہ اس کے لیے جائز ہے۔ رہے عام آدمی، تو ان کے لیے ان کے اپنے گھر اور ان لوگوں کے گھر جن کا ذکر کیا گیا ہے، یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحب خانہ با قاعدہ اجازت دے تو کھائیں ورنہ خیانت ہو گی۔ آدمی اگر ان میں سے کسی کے ہاں جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اس کے بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بے تکلف کھایا جاسکتا ہے۔

جن رشتہ داروں کے نام یہاں لیے گئے ہیں ان میں اولاد کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ آدمی کی اولاد کا گھر اس کا اپنا ہی گھر ہے۔

دوستوں کے معاملے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان سے مراد بے تکلف اور جگری دوست ہیں جن کی غیر موجودگی میں اگر یار لوگ ان کا حلوا اڑا جائیں تو ناگوار گزرنا تو درکنار انہیں اس پر الٹی خوشی ہو۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 96 ▲

قدیم زمانے کے اہل عرب میں بعض قبیلوں کی تہذیب یہ تھی کہ ہر ایک الگ الگ کھانا لے کر بیٹھے اور کھائے۔ وہ مل کر ایک ہی جگہ کھانا برائی سمجھتے تھے، جیسا کہ ہندوؤں کے ہاں آج بھی برائی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بر عکس بعض قبیلے تہا کھانے کو بر اجاننتے تھے، حتیٰ کہ فاقہ کر جاتے تھے اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہو۔ یہ آیت اسی طرح کی پابندیوں کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

٩٦ رکوٰ

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ أَمْنَوْا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ آمْرِ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا
 حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُوكَ أُولَئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۝ فَإِذَا
 اسْتَأْذِنُوكُلَّ بَعْضٍ شَاءُوكُلُّهُمْ فَأَذِنْ لِمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهُ ۝ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
 ۝ لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءٍ بَعْضِكُمْ بَعْضاً ۝ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ
 يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَادِاً ۝ فَلَيَحْذِرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةً أَوْ
 يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أَلَا إِنَّ اللَّهَ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ وَ
 يَوْمَ يُرْجَعُونَ إِلَيْهِ فَيُنَتِّهُمْ بِمَا أَعْمَلُوا ۝ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

۹ رکوٰہ

97 مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول ﷺ کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ **98** جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول ﷺ کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں **99** تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو **100** اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعاۓ مغفرت کیا کرو، **101** اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے۔

مسلمانو، اپنے درمیان رسول ﷺ کے بلالے کو آپس میں ایک دوسرے کا سابلانا نہ سمجھ بیٹھو۔ **102** اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چُکے سے سٹک جاتے ہیں۔ **103** رسول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں **104** یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے۔ خبردار رہو، آسمان وزمین جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روشن پر بھی ہو اللہ اُس کو جانتا ہے۔ جس روز تم اُس کی طرف پلٹو گے وہ تمہیں بتادے گا کہ تم کیا کچھ کر کے آئے ہو۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ۶

سورة النور حاشیہ نمبر: 97 ▲

یہ آخری ہدایات ہیں جو مسلمانوں کی جماعت کا نظم و ضبط پہلے سے زیادہ کس دینے کے لیے دی جا رہی ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 98 ▲

یہی حکم نبی ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے جانشینوں اور اسلامی نظام جماعت کے امراء کا بھی ہے۔ جب کسی اجتماعی مقصد کے لیے مسلمانوں کو جمع کیا جائے، قطع نظر اس سے کہ جنگ کا موقع ہو یا حالت امن کا، بہر حال ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر واپس چلے جائیں یا منتشر ہو جائیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 99 ▲

اس میں یہ شبیہ ہے کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر اجازت طلب کرنا تو سرے سے ہی ناجائز ہے۔ جواز کا پہلو صرف اس صورت میں نکلتا ہے جبکہ جانے کے لیے کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 100 ▲

یعنی ضرورت بیان کرنے پر بھی اجازت دینا یا نہ دینا رسول کی، اور رسول کے بعد امیر جماعت کی مرضی پر موقوف ہے اگر وہ سمجھتا ہو کہ اجتماعی ضرورت اس شخص کی انفرادی ضرورت کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے تو وہ پورا حق رکھتا ہے کہ اجازت نہ دے، اور اس صورت میں ایک مومن کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 101 ▲

اس میں پھر شبیہ ہے کہ اجازت طلب کرنے میں اگر ذرا سی بہانہ بازی کا بھی دخل ہو، یا اجتماعی ضروریات پر انفرادی ضروریات کو مقدم رکھنے کا جذبہ کار فرم� ہو تو یہ ایک گناہ ہے۔ لہذا رسول اور اس کے جانشین کو صرف اجازت دینے ہی پر اکتفانہ کرنا چاہیے بلکہ جسے بھی اجازت دے، ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہہ دے کہ خدا تمہیں معاف کرے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 102 ▲

اصل میں لفظ **دُعَاء** استعمال ہوا ہے جس کے معنی بلا نے کے بھی ہیں اور دعا کرنے اور پکارنے کے بھی۔ نیز

دُعَاء الرَّسُول کے معنی رسول کا بلا نا یا دعا کرنا بھی ہو سکتا ہے اور رسول کو پکارنا بھی۔ ان مختلف معنوں کے لحاظ سے آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی صحیح و معقول ہیں :

اول یہ کہ "رسول ﷺ کے بلا نے کو عام آدمیوں میں سے کسی کے بلا نے کی طرح نہ سمجھو" یعنی رسول ﷺ کا بلا وغیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرا کوئی بلا نے اور تملبیک نہ کہو تو تمہیں آزادی ہے، لیکن رسول ﷺ بلا نے اور تم نہ جاؤ، یادل میں ذرہ برابر بھی تنگی محسوس کرو تو ایمان کا خطرہ ہے۔

دوم یہ کہ "رسول ﷺ کی دعا کو عام آدمیوں کی سی دعا نہ سمجھو" وہ تم سے خوش ہو کر دعا دیں تو تمہارے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اور ناراض ہو کر بد دعا دے دیں تو تمہاری اس سے بڑھ کر کوئی بد نصیبی نہیں۔

سوم یہ کہ "رسول ﷺ کا پکارنا عام آدمیوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی طرح نہ ہونا چاہیے"۔ یعنی تم عام آدمیوں کو جس طرح ان کے نام لے کر بآواز بلند پکارتے ہو اس طرح رسول اللہ ﷺ کو نہ پکارا کرو۔ اس معاملے میں ان کا انتہائی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے، کیونکہ ذرا سی بے ادبی بھی اللہ کے ہاں مو اخذے سے نہ بچ سکے گی۔

یہ تینوں مطلب اگرچہ معنی کے لحاظ سے صحیح ہیں اور قرآن کے الفاظ تینوں کو شامل ہیں، لیکن بعد کے مضمون سے پہلا مطلب ہی مناسب رکھتا ہے۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 103 ▲

یہ منافقین کی ایک اور علامت بتائی گئی ہے کہ اسلام کی اجتماعی خدمات کے لیے جب بلا یا جاتا ہے تو وہ آ تو جاتے ہیں، کیونکہ مسلمانوں میں کسی نہ کسی وجہ سے شامل رہنا چاہتے ہیں، لیکن یہ حاضری ان کو سخت ناگوار ہوتی ہے اور کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر نکل بھاگتے ہیں۔

سورة النور حاشیہ نمبر: 104 ▲

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فتنہ کا مطلب "ظالموں کا تسلط" لیا ہے۔ یعنی اگر مسلمان رسول اللہ ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو ان پر جابر و ظالم حکمران مسلط کر دیے جائیں گے۔ بہر حال فتنے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اور اس کے سواد و سری بے شمار صورتیں بھی ممکن ہیں۔ مثلاً آپس کے تفرقے اور خانہ جنگیاں، اخلاقی زوال، نظام جماعت کی پرا گندگی، داخلی انتشار، سیاسی اور مادی طاقت کا ٹوٹ جانا، غیروں کا محکوم ہو جانا وغیرہ۔